

© جمہ حقو ق بحق پبلشر محفوظ ہیں۔

نام کتاب : اردو اصنافِ ادب
مرتب : عطاء الرحمن نوری
سال اشاعت : 2016ء
تعداد : ایک ہزار
صفحہات : 64
کمپوزنگ : عطاء الرحمن نوری
طباعت : سیفنی آفسیٹ پریس، مایگاؤں
قیمت : 40/-

----- Publisher-----

Rahmani Publication

1032, Islampura, Malegaon-423203 (Dist-Nasik)

Mob : 9890801886 / 9270704505

(C) All rights reserved with Publisher

رحمانی پبلی کیشنز کی مطبوعات سے متعلق کسی بھی تنازعہ کا
حق سماعت صرف مایگاؤں کی عدلیہ میں ہوگا۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

ایم اے، نیٹ، سیٹ، پیٹ، یو پی ایس سی و دیگر
مقابلہ جاتی امتحانات کے لیے ایک معاون ماخذ

اُردو اصنافِ ادب



مرتب:

عطاء الرحمن نوری

M.A., B.Ed., MH-SET, Journalist

E-mail - atanoori92@gmail.com

Cell.: 9270969026

----- پبلشر -----

رحمانی پبلکیشنز

1032 انصار روڈ، ڈاکٹر سراج احمد کے دو اٹانے کے سامنے، اسلامپورہ،

مایگاؤں، مہاراشٹر 9270704505 / 9890801886 Mob :

فہرست

(A)-اصناف شعر

| | |
|----|--------------------------|
| 11 | (الف) موضوع کے اعتبار سے |
| 11 | (۱)- حمد |
| 12 | (۲)- مناجات |
| 13 | (۳)- نعت |
| 14 | (۴)- منقبت |
| 15 | (۵)- غزل |
| 17 | (۶)- قصیدہ |
| 22 | (۷)- مرثیہ |
| 26 | (۸)- شہر آشوب |
| 27 | (۹)- واسوخت |
| 28 | (۱۰)- ریختی |
| 29 | (۱۱)- پیروڈی |
| 30 | (۱۲)- گیت |
| 31 | (۱۳)- ہجو |
| 32 | (ب)- ہیئت کے اعتبار سے |
| 32 | (۱)- مثنوی |
| 33 | (۲)- رباعی |

| | |
|----|----------------------|
| 34 | (۳)- قطعہ |
| 34 | (۴)- مُسمَّط |
| 35 | (۵)- ترکیب بند |
| 36 | (۶)- ترجیع بند |
| 37 | (۷)- نظم |
| 39 | ☆- پابند نظم |
| 40 | ☆- معری نظم |
| 40 | ☆- آزاد نظم |
| 41 | (۸)- سانیٹ |
| 42 | (۹)- ترایلے |
| 43 | (۱۰)- ہائیکو |
| 44 | (۱۱)- نثری شاعری |
| 44 | (B)-اصناف نثر |
| 44 | (۱)- سادہ نثر |
| 45 | (۲)- سلیس نثر |
| 45 | (۳)- مفہمی نثر |
| 46 | (۴)- مسجع نثر |
| 46 | (۵)- رنگین نثر |
| 47 | (الف)- افسانوی نثر |
| 47 | (۱)- داستان |

کلمہ تعارف

عطاء الرحمن نوری (مبلغ سنی دعوتِ اسلامی) کا نام اب دینی و علمی اور ادبی و صحافتی دنیا میں نیا نہیں رہا۔ وہ گزشتہ کئی برسوں سے مذہبی و اصلاحی موضوعات پر مسلسل لکھ رہے ہیں۔ ایک دعوتی و اصلاحی تحریک ”سنی دعوتِ اسلامی“ سے منسلک ہونے کی وجہ سے اُن کے اندر اصلاح امت اور صالح معاشرے کی تشکیل کے تئیں مثبت رویے بھی پائے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے مضامین میں اصلاح معاشرہ کا گہرا چاؤ پایا جاتا ہے۔ سلجھے ہوئے انداز میں وہ سنجیدہ خطابت کے ذریعے بھی پیغامِ حق و صداقت پھیلانے میں مصروف ہیں۔ عطاء الرحمن نوری کے تحریر کردہ مضامین ملک بھر کے اخبارات و رسائل کی زینت بن کر اہل علم و دانش سے خراجِ تحسین وصول کر رہے ہیں۔

۳ مارچ ۱۹۸۸ء کو شہر ادب مالینگاؤں میں آنکھ کھولنے والے اس نوجوان نے فارمیسی میں ڈپلومہ کرنے کے بعد اپنا تعلیمی سلسلہ شوق جاری رکھتے ہوئے صحافت کا کورس مکمل کیا۔ مزید برآں اردو ادب میں ایم۔ اے کرنے کے بعد انھوں نے ۶ ستمبر بروز اتوار ۲۰۱۵ء کو ریاست مہاراشٹر کی جانب سے پہلی بار اردو زبان میں منعقدہ اسٹیٹ لیبیریٹی ٹیسٹ (سیٹ) جیسے مشکل ترین مقابلہ جاتی میں حصہ لیا، اور اس مشکل ترین امتحان میں پہلی ہی شرکت میں نمایاں کامیابی حاصل کر لی، اس کے بعد بھی وہ خاموش نہیں بیٹھے اور حصولِ تعلیم کے لیے نئے جزائر کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہوئے فی الحال بی۔ ایڈ میں مصروف ہیں۔ دعا ہے کہ مستقبل میں اُن کے پی ایچ ڈی کے مستحکم ارادے کو اللہ کریم پایہ تکمیل تک پہنچائے۔ آمین!!

عطاء الرحمن نوری کا قلمی سفر مضامین و مقالات سے آگے بڑھتے ہوئے تصنیف و تالیف کے میدان کی طرف رواں دواں ہے۔ پیش نظر کتاب ”اردو اصنافِ ادب“ سے پہلے اُن کے موئے قلم نے چار کتب کا تحفہ دینی و علمی دنیا کو پیش کر کے اہل نقد و نظر کو اپنی طرف متوجہ کر لیا ہے۔ اُن کی پہلی پیش کش دنیائے کفر سے ۱۲۵ لڑائیاں لڑنے والے عظیم المرتبت مجاہد، اسلامی تاریخ

| | |
|----|----------------------|
| 48 | (۲)۔ ناول |
| 48 | (۳)۔ افسانہ |
| 49 | (۴)۔ ڈرامہ |
| 50 | (ب)۔ غیر افسانوی نثر |
| 50 | (۱)۔ مضمون |
| 51 | (۲)۔ انشائیہ |
| 52 | (۳)۔ خطوط یا مکتوب |
| 53 | (۴)۔ سوانح |
| 53 | (۵)۔ خودنوشت سوانح |
| 54 | (۶)۔ دیباچہ |
| 55 | (۷)۔ سفرنامہ |
| 56 | (۸)۔ آپ بیتی |
| 57 | (۹)۔ خاکہ |
| 58 | (۱۰)۔ رپورتاژ |
| 58 | (۱۱)۔ طنز و مزاح |
| 59 | (C)۔ تنقید |
| 60 | (D)۔ تحقیق |
| 61 | (E)۔ تذکرہ |

بند، ترجیح بند، نظم، پابند نظم، معری نظم، آزاد نظم، سانیٹ، تراہیلے، ہائیکو، نثری شاعری کی تعریفیں مع مثال پیش کی ہیں۔

اصنافِ ادب کے دوسرے جز یعنی ”اصنافِ نثر“ میں عطاء الرحمن نوری نے سادہ نثر، سلیس نثر، منطقی نثر، مسجع نثر، رنگین نثر کی تعریفیں اور مثالیں پیش کی ہیں اس کے علاوہ اس باب کو دو ضمنی حصوں میں تقسیم کرتے ہوئے (الف) افسانوی نثر کے تحت: داستان، ناول، افسانہ، ڈرامہ کا تعارف پیش کیا ہے اور (ب) غیر افسانوی نثر کے تحت: مضمون، انشائیہ، خطوط یا مکتوب، سوانح، خودنوشت سوانح، دیباچہ، سفرنامہ، آپ بیتی، خاکہ، رپورتاژ، طنز و مزاح جیسی اصنافِ نثر کا بہترین انداز میں تعارف کرایا ہے۔ ان کے علاوہ (C) تنقید (D) تحقیق اور (E) تذکرہ بھی اپنے موضوع کے اعتبار سے معلومات افزا ہیں۔

عطاء الرحمن نوری کی مرتبہ ”اردو اصنافِ ادب“ اردو دنیا کے لیے ایک گراں قدر اور بہترین تحفہ ہے۔ ان شاء اللہ ادب کے طلبہ، مقابلہ جاتی امتحانات کے شرکاء، کالج کے پروفیسرز، نقاد اور شعرا وادبا مرتب کی اس اہم ادبی خدمت سے یقیناً مستفیض ہوں گے۔

عطاء الرحمن نوری کی یہ اہم پیش کش ایک نفع بخش علم کی ترویج و اشاعت کے زمرے میں ہی شمار کی جائے گی جو ایک قسم کا صدقہ جاریہ بھی ہے۔ ناچیز برادر م عطاء الرحمن نوری کو اس اہم کتاب کی ترتیب و اشاعت پر ہدیہ تبریک و تہنیت پیش کرتے ہوئے دعا گو ہے کہ اللہ کریم جل جلالہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقہ و طفیل اُن کے صالح عزائم کو استیقام تکمیل سے ہمکنار فرمائے، آمین!!

(ڈاکٹر)۔ محمد حسین مشاہد رضوی

۲۷ ذوالحجہ ۱۴۳۳ھ / ۳۰ ستمبر ۲۰۱۶ء بروز جمعہ

Dr. Muhammed Husain Mushahid Razvi

S.r. No. 39 P.No. 14 Naya Islampura

Malegaon 423203 Nashik (M.S.)

mushahidrazvi79@gamil.com

09420230235 / 09021761740

کے اولوالعزم شمشیر آزما، نام و رسپہ سالار اور عبقری جرنیل حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے مختصر تعارف پر مبنی کتاب ”حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ“ اسلام کے اس بطلِ جلیل کا معلومات افزا قبالہ ہے۔ دوسری کتاب ”حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ“ اسلام کی مہتمم بالشان اور اولین درس گاہ نبوت کے ممتاز طالب علم اور ذخیرہ حدیث کے سب سے بڑے راوی کے رخِ حیات کے مختلف جگمگاتے گوشوں کو سمیٹے ہوئے ہے۔ تیسری پیش کش ”حضرت سید احمد کبیر رفاعی کی چند ناصحانہ باتیں“ سلسلہ رفاعیہ کے سر تاج سلطان الاولیاء و العارفین حضرت سید احمد کبیر رفاعی قدس سرہ العزیز کے اقوال و ارشادات کا دل کش مرقع ہے، جس کا مطالعہ عملی زندگی کی کامیابی و کامرانی اور دنیوی و اخروی فلاح کی ضمانت میں معاون ثابت ہوگا۔ عطاء الرحمن نوری کی چوتھی پیش کش ”جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں علما کا مجاہدانہ کردار“ وطن عزیز ہندوستان کی آزادی میں نمایاں کردار ادا کرنے والے علما و قائدین کا مختصر مگر جامع تعارف علمائے اہل سنت کی کتب و رسائل کی روشنی میں خوانِ مطالعہ پر سجایا ہے۔ عطاء الرحمن نوری کی یہ قلمی ریاضتیں یقیناً سراہے جانے کے لائق ہیں۔

پیش نظر کتاب ”اردو اصنافِ ادب“ اس لحاظ سے بھی اہمیت کی حامل ہے کہ عطاء الرحمن نوری نے اسے ایم اے، نیٹ، پیٹ، یو پی ایس سی اور دیگر مقابلہ جاتی امتحانات میں حصہ لینے والے طلبہ کے استفادہ کی غرض سے مرتب کیا جو ایک طرح سے خیر کا عمل ہے۔ جس کا اجر اللہ رب العزت جل جلالہ بہتر طور پر ادا فرمائے گا۔

”اردو اصنافِ ادب“ میں عطاء الرحمن نوری نے اردو کی مروجہ اصنافِ ادب کا آسان اور صاف ستھری علمی زبان میں مثالوں اور حوالوں کے ساتھ تعارف پیش کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔

اس کتاب میں اصنافِ ادب کے دونوں حصوں (A) اصنافِ سخن یعنی شعر و شاعری اور (B) اصنافِ نثر کا تعارف کراتے ہوئے، اصنافِ سخن یعنی شعر و شاعری کو موضوع اور ہیئت کے اعتبار سے دو خانوں میں تقسیم کرتے ہوئے عطاء الرحمن نوری نے (الف) موضوع کے اعتبار سے تقسیم، (ب) ہیئت کے اعتبار سے تقسیم کے تحت: حمد، مناجات، نعت، منقبت، غزل، قصیدہ، مرثیہ، شہر آشوب، واسوخت، ریختی، پیروڈی، گیت، ہجو..... اور..... مثنوی، رباعی، قطعہ، مسمط، ترکیب

حرفے چند

ایم اے سال دوم (۲۰۱۵ء) ہی سے یو جی سی کے تحت اسٹنٹ پروفیسر شپ اور پی ایچ ڈی کی اہلیت کے لیے ہونے والے معروضی امتحان ”نیٹ“ کی تیاری شروع کر دی تھی، اب یہ امتحان یو جی سی کی نگرانی میں سی بی ایس سی کے تحت منعقد ہوتا ہے۔ اس امتحان کی تیاری کے لیے طے شدہ نصاب کے مطابق اپنی اسٹڈی کا آغاز کیا، اساتذہ کرام نے رہنمائی فرمائی، سٹی بک ڈپو مالیکوؤں سے معروضی امتحانات کے متعلق دستیاب تمام کتابیں خریدیں، دہلی، ممبئی سے کتابیں منگوائیں اور نصاب کے پیش نظر ذاتی نوٹس کی ترتیب کا کام شروع کیا۔ اسی دوران ۶ ستمبر بروز اتوار ۲۰۱۵ء کو ریاست مہاراشٹر کی جانب سے اسٹیٹ انجیلیٹی ٹیسٹ کا پہلی بار اردو مضمون میں انعقاد ہوا، اس امتحان کی تیاری کے لیے مذکورہ نوٹس کافی مددگار ثابت ہوئیں، جس میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی اور ساوتری بائی پھلے پونا یونیورسٹی کی نصابی کتابوں سے، گھر میں موجود ادبی کتابوں اور آن لائن دستیاب ہر صنف پر مخصوص کتابوں کی مدد سے اضافہ کیا۔ اللہ پاک نے اپنے پیارے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقے پہلی ہی کوشش میں ایم ایچ سیٹ جیسے مشکل امتحان میں کامیابی عطا فرمائی۔ اسی اثنا میں ایم ایس جی کالج میں اسٹنٹ پروفیسر شپ کے لیے ویکینسی نکلی، مذکورہ نوٹس کو ہم نے از سر نو مرتب کیا اور ۱۶ مئی ۲۰۱۶ء کو ناسک ہیڈ آفس میں کامیاب انٹرویو دیا۔ اسی کے ساتھ تعلیمی سرگرمیاں جاری رہیں، بی ایڈ کی پڑھائی بھی ہوتی رہی

اور محب مکرم رضوان ربانی سر کے حکم پر ادارہ فیضان ربانی اسلام پورہ مالیکوؤں میں فری نیٹ اور سیٹ کی کلاسیس میں لیکچرز بھی لیتا رہا۔ دوست و احباب نے جب اس نوٹس کو دیکھا تو اصرار کیا کہ اسے شائع کیا جائے تاکہ ہر طالب علم اس سے استفادہ کر سکے۔ یوں تو مارکیٹ میں بہت سی ادبی کتابیں دستیاب ہیں مگر رسائی اور توجہ کی کمی کے سبب اسٹوڈنٹس امتحان کے وقت کشمکش کا شکار رہتے ہیں، حتیٰ کہ ماسٹر ڈگری میں آنے کے بعد بھی اردو اصناف ادب سے انہیں مکمل واقفیت نہیں ہو پاتی۔ اس لیے تمام اصناف ادب کو بہت ہی مختصر میں پیش کیا جا رہا ہے تاکہ صفحات کی زیادتی کے سبب اسٹوڈنٹس بوجھل پن اور اکتاہٹ کا شکار نہ ہوں۔ ایم اے، نیٹ، سیٹ، پیٹ، یو پی ایس سی اور دیگر مقابلہ جاتی امتحانات کے لیے ایک تفصیلی کتاب اختتامی مراحل میں ہے۔ ان امتحانات کے لیے یہ رسالہ ایک اہم ضرورت کی تکمیل ہے۔ ان امتحانات میں کامیابی کے لیے کتاب میں موجود تمام اصناف ادب کا گہرائی و گہرائی سے مستقل مزاجی اور سخت محنت کے ساتھ مطالعہ کرنا از حد ضروری ہے۔

مرتب:

عطاء الرحمن نوری

M.A., B.Ed., MH-SET
Journalist

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

دنیا کی تمام زبانوں کے ادب کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح اردو زبان

و ادب میں بھی اصناف ادب کے دو حصے ہیں۔

(A) اصناف سخن یعنی شعر و شاعری۔

(B) اصناف نثر۔

اصناف سخن کو موضوع اور ہیئت کے اعتبار سے دو خانوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

(الف) موضوع کے اعتبار سے تقسیم:

موضوع کے لحاظ سے اردو شاعری کی مندرجہ ذیل قسمیں بیان کی جاتی ہیں۔

(۱) حمد (۲) مناجات (۳) نعت (۴) منقبت (۵) غزل (۶) قصیدہ (۷) مرثیہ

(۸) شہر آشوب (۹) واسوخت (۱۰) ریختی (۱۱) پیروڈی (۱۲) گیت (۱۳) ہجو۔

(ب) ہیئت کے اعتبار سے تقسیم:

ہیئت کے لحاظ سے اردو شاعری کی مندرجہ ذیل قسمیں بتائی جاتی ہیں۔

(۱) مثنوی (۲) رباعی (۳) قطعہ (۴) مُستط (۵) ترکیب بند (۶) ترجیع بند (۷) نظم ☆ پابند

نظم ☆ معری نظم ☆ آزاد نظم (۸) سانیٹ (۹) تراخیلہ (۱۰) ہائیکو (۱۱) نثری شاعری۔

(الف) موضوع کے لحاظ سے اصناف سخن کی تعریف و تفصیل:

☆ شعر: شعر غزل کے ایک حصے کو کہتے ہیں۔ شعر کی سطر کو مصرع کہا جاتا ہے۔

(۱) حمد:

حمد ایک عربی لفظ ہے، جس کے معنی ”تعریف“ کے ہیں۔ اللہ کی تعریف میں کہی جانے

والی نظم کو ”حمد“ کہتے ہیں۔ حمد باری تعالیٰ کئی زبانوں میں لکھی جاتی رہی ہیں۔ عربی، فارسی اور اردو

زبان میں اکثر دیکھی جاسکتی ہیں۔ حمد کے لیے ضروری ہے کہ شاعر بارگاہِ صمدیت کے آداب کا مکمل

خیال رکھے، لب و لہجہ انتہائی مؤدب اور عاجزانہ و انکسارانہ ہو۔ زبان پاکیزہ، شستہ اور مبلغ ہو۔ ساتھ ہی شاعر اس بات کا بھی دھیان رکھے کہ حمد عشقِ الہی میں ڈوب کر تحریر کی جائے نہ کہ محض رسمی اور دکھاوے کے لیے ہو۔ ذیل میں مولانا احمد رضا کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

وہی رب ہے جس نے تجھ کو ہمہ تن کرم بنایا

ہمیں بھیک مانگنے کو ترا آستاں بتایا

تمہیں حاکم برایا تمہیں قاسم عطا یا

تمہیں دافع بلا یا تمہیں شافع خطایا

(۲) مناجات:

مناجات کا مطلب ہے دعا۔ ایسا کلام جو بارگاہِ صمدیت میں بطور التجا پیش کیا جاتا ہے

مناجات کہلاتا ہے۔

الہی مدد کر مدد کی گھڑی ہے

گناہوں کے دلدل میں کشتی پھنسی ہے

مرے دل پہ غفلت کی چادر پڑی ہے

نخواست گناہوں کی چھائی ہوئی ہے

یہی بات ہم نے بڑوں سے سنی ہے

نہ ہو بندگی گر تو کیا زندگی ہے

اے ابر کرم آ برس جا برس جا

عجب آگ عصیاں کی مجھ میں لگی ہے

نہیں پاس حسن عمل میرے مولیٰ

نظر میری تیرے کرم پر لگی ہے

عبید رضا نیکیوں سے ہے خالی

گناہوں میں حاصل اسے برتری ہے

(۳) نعت:

پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدحت، تعریف و توصیف، شائے و خصائص اور کمالات و اختیارات کے شعری اندازِ بیاں کو نعت یا نعت خوانی یا نعت گوئی کہا جاتا ہے۔ عربی زبان میں نعت کے لیے لفظ ”مدح النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم“ یا ”المدح النبویہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم“ استعمال ہوتا ہے۔ مگر اردو اور فارسی میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اوصاف حمیدہ اور خصائص جمیلہ بیان کرنے کو ”نعت“ کہتے ہیں۔ نعت لکھنے والے کو نعت گو شاعر جبکہ نعت پڑھنے والے کو نعت خواں یا ثناء خواں کہا جاتا ہے۔ اسلام کی ابتدائی تاریخ میں بہت سے صحابہ کرام نے نعتیں لکھیں اور یہ سلسلہ آج تک جاری و ساری ہے۔ اولین نعت گو شعراء میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا ابوطالب اور اصحاب میں حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ پہلے نعت گو شاعر اور نعت خواں تھے۔ اسی بنا پر حضرت حسان رضی اللہ عنہ کو ”شاعر دربار رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم“ بھی کہا جاتا ہے۔ ذیل میں آپ کے نعتیہ اشعار ہیں۔

وَأَحْسَنُ مَنْكَ لَمْ تَرَ قَطُّ عَيْنِي
وَأَجْمَلُ مَنْكَ لَمْ تَلِدِ الْبِنَاءِ
خَلَقْتَ مَبْرءَ أَمْنٍ كُلِّ عَيْبِ
كَانَكَ قَدْ خَلَقْتَ كَمَا تَشَاءُ

ترجمہ: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ سے حسین تر میری آنکھ نے کسی کو نہیں دیکھا، آپ جیسا حسین و جمیل کسی ماں نے جنا نہیں، آپ کو ہر عیب سے پاک پیدا فرمایا گیا، گویا آپ نے جیسا چاہا تھا ویسا ہی ہوا۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود کئی مرتبہ حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ سے نعت سماعت فرمائی۔ حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کے علاوہ بھی ایک طویل فہرست ہے، ان صحابہ کرام کی کہ جنہوں نے حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نعتیں لکھیں اور پڑھیں۔ جب حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ سے ہجرت فرما کر مدینے تشریف لائے تو آپ کے استقبال میں انصار کی بچیوں نے دف پر نعت پڑھی، جس کا درج ذیل شعر شہرتِ دوام پا گیا۔

طلع البدر علينا من ثنيات الوداع
وجبت شکر علينا ما دعا لله داع

حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کے علاوہ حضرت اسود بن سربج رضی اللہ عنہ، حضرت عبد اللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ، حضرت عامر بن اکوع رضی اللہ عنہ، حضرت عباس بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ، حضرت کعب بن زہیر رضی اللہ عنہ اور حضرت نابغہ جعدی رضی اللہ عنہ نعتیں پڑھیں۔ صحابہ کرام کے بعد امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ، مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ، شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ، مولانا جامی رحمۃ اللہ علیہ، امام بویری رحمۃ اللہ علیہ، ڈاکٹر اقبال، مولانا احمد رضا خان رحمۃ اللہ علیہ اور متعدد عشاق کی اس صنف کو فروغ دے رہے ہیں۔ نعت میں ایسے مضامین لانے چاہیے جو نبی کریم ﷺ کی شان کے مطابق ہوں، جنہیں سننے اور پڑھنے کے بعد نبی کریم ﷺ کی عظمت، شانِ رفعت، بزرگی، کمالات اور اختیار سے واقفیت ہو اور دلوں پر روحانی و اخلاقی اثرات مرتب ہوں۔

ان کی مہک نے دل کے غنچے کھلا دیے ہیں
جس راہ چل دیے ہیں کوچے بسا دیے ہیں
ان کے نثار کوئی کیسے ہی رنج میں ہو
جب یاد آگئے ہیں سب غم بھلا دیے ہیں

(۴) منقبت:

لفظ ”منقبت“ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی تعریف میں لکھے ہوئے اشعار کو کہا جاتا ہے۔ مگر عرف عام میں اشعار کے ذریعے کسی بزرگ یا ولی یا برگزیدہ شخصیت کی تعریف کرنے کو منقبت کہتے ہیں۔ نواسہ رسول حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی شان میں پروفیسر ڈاکٹر ادیب رائے پوری کی منقبت بطور نمونہ ملاحظہ فرمائیں۔

آیا نہ ہوگا اس طرح حسن و شباب ریت پر
گلشنِ فاطمہ کے تھے سارے گلاب ریت پر

دل سے تری نگا ہ جگر تک اتر گئی
دونوں کو اک نظر میں رضامند کر گئی
(غالب)

اس شعر میں ”اثر“ اور ”کر“ قافیہ ہیں اور ردیف ”گئی“ ہے۔ غزل کا آخری شعر مقطع کہلاتا ہے اور اس میں شاعر اپنا تخلص استعمال کرتا ہے۔

میر ان نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

غزل کے پہلے شعر کو ”مطلع“ اور آخری شعر کو ”مقطع“ کہا جاتا ہے جس میں عام طور پر شاعر اپنا تخلص استعمال کرتا ہے۔ غزل کا سب سے اچھا شعر ”بیت الغزل“ کہلاتا ہے۔ مطلع کے دونوں مصرعوں کی ردیف اور ان کا قافیہ ایک ہوتا ہے۔ لیکن مطلع کے بعد کے اشعار میں اس کی پابندی نہیں کی جاتی۔ بعض میں ایک سے زائد مطلعے ہوتے ہیں۔ دوسرا مطلع ”مطلع ثانی“ کہلاتا ہے اس کے بھی دونوں مصرعوں میں ردیف و قافیہ کی پابندی کی جاتی ہے۔ غزل کا ہر شعر ایک علاحدہ اکائی ہوتا ہے اور وہ معنوی اعتبار سے اپنے طور پر مکمل ہوتا ہے۔ اس کا دوسرے اشعار سے معنوی ربط نہیں ہوتا لیکن بعض غزلوں میں دو یا تین ایسے مسلسل اشعار موجود ہوتے ہیں جن میں ربط مضمون اور خیال کا تسلسل پایا جاتا ہے، ایسے اشعار ”قطعہ“ کہلاتے ہیں۔ بعض ایسی غزلیں ہوتی ہیں جن کے تمام اشعار میں تسلسل موجود ہوتے ہیں اور وہ ایک دوسرے سے مربوط ہوتے ہیں ایسی غزل کو ”مسلّس غزل“ کہتے ہیں۔ غزل کے اشعار کی تعداد تین سے چھاس تک متعین کی گئی ہے لیکن عام طور پر سات، نو یا گیارہ یعنی طاق اشعار پر مشتمل ایک غزل ہوتی ہے۔

بیت یا شکل کے اعتبار سے غزل کے اجزائے ترکیبی یہ ہیں۔ مطلع، قافیہ، ردیف اور مقطع۔
محمد قلی قطب شاہ، غواصی، نصرتی، ولی، میر، درد، آتش، ناسخ، غالب، مومن، حسرت، فانی، جگر، مجروح، اور ناصر کاظمی وغیرہ اردو کے چند مشہور غزل گو شعرا ہیں۔
☆ بیت الغزل: غزل کے سب سے بہترین شعر کو بیت الغزل کہتے ہیں۔

جان بتول کے سوا کوئی نہیں کھلا سکا
قطرہ آب کے بغیر اتنے گلاب ریت پر
عشق میں کیا لٹائیے، عشق میں کیا بچائیے
آل نبی نے لکھ دیا سارا نصاب ریت پر
جتنے سوال عشق نے، آل رسول سے کیے
ایک کے بعد اک دئے، سارے جواب ریت پر
پیاسا حسین کو کہوں اتنا تو بے ادب نہیں
لمس لب حسین کو ترسا ہے آب ریت پر
آل نبی کا کام تھا آل نبی ہی کر گئے
کوئی نہ لکھ سکا ادیب ایسی کتاب ریت پر

(۵) غزل:

غزل کا لفظ غزال سے نکلا ہے اور غزال ہرن کو کہتے ہیں غزل ہرن کے گلے سے نکلنے والی اُس آواز کو کہا جاتا ہے جب وہ شیر کے خوف سے بھاگ رہی ہوتی ہے غزل کے لغوی معنی عورتوں سے باتیں کرنا یا عشق و محبت کا ذکر کرنا بھی بتایا گیا ہے۔ غزل کے لغوی معنی عورت سے باتیں کرنا ہے یعنی غزل عشق و محبت کی قلبی واردات کی ترجمان ہوتی ہے۔ اصطلاح شاعری میں غزل سے مراد وہ صنفِ نظم ہے جس کا ہر ایک شعر الگ مضمون کا حامل ہو اور اس میں عشق و عاشقی کی باتیں بیان ہوئی ہوں خواہ وہ عشق حقیقی ہو یا عشق مجازی۔ لیکن آج کل غزل میں عشق و عاشقی کے علاوہ دنیا کا کوئی بھی موضوع زیر بحث لایا جاتا ہے۔ اس کا آغاز فارسی زبان سے ہوتا ہے۔ لیکن اس سلسلے میں اس کے عربی زبان سے تعلق سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ عربی صنفِ قصیدہ میں موجود تشبیب سے ہی غزل کی ابتداء ہوئی۔ غزل کے موضوعات میں بڑی وسعت اور رنگارنگی ہوتی ہے۔ غزل اردو کی مقبول ترین صنفِ سخن ہے۔ اس کی خصوصیت ہیئت ہوتی ہے۔ غزل کا پہلا شعر مطلع کہلاتا ہے اس کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں جیسے۔

مثلاً: مجروح سلطان پوری کا ایک شعر ملاحظہ کریں:

میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

☆ فرد: شاعری میں ایک اکیلے شعر کو فرد کہتے ہیں۔

☆ مصرع: شعر کی ایک سطر کو مصرع کہتے ہیں۔

☆ مطلع: کسی بھی غزل (شاعری) میں پہلے شعر کو مطلع کہتے ہیں جس کے دونوں مصرعے ہم قافیہ اور ہم ردیف ہوتے ہیں۔ غزل میں اگر پہلے ”مطلع“ کے بعد ”دوسرا مطلع“ بھی ہو، تو اسے ”حسن مطلع“ کہتے ہیں۔

☆ حسن مطلع: مطلع کے فوراً بعد آنے والے شعر کو کہتے ہیں۔ اسے زیب مطلع بھی کہا گیا ہے۔

☆ مقطع: مقطع کے معنی قطع کرنے کے ہیں چونکہ شاعر اپنی شاعری کے اختتامی شعر میں اپنا تخلص استعمال کرتا ہے، اسی آخری شعر کو مقطع کہا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر نجف شیرازی کا مقطع دیکھیں۔
جب سے دیکھا تجھے حال یہ ہے مرا
مجھ کو کہتا ہے پاگل زمانہ نجف

(۶) قصیدہ:

قصیدہ لفظ ”قصد“ سے مشتق ہے۔ اصطلاح شاعری میں قصیدہ ایسی شاعری کو کہتے ہیں جس میں قصد یا ارادے سے کسی کی تعریف یا مذمت کی جاتی ہے۔ تعریف ہو تو قصیدہ مدحیہ کہلاتا ہے اور مذمت ہو تو ہجو۔ قصیدہ دراصل اس مسلسل نظم کو کہتے ہیں جس کے پہلے شعر کے دونوں اور باقی تمام اشعار کے دوسرے مصرعے ہم قافیہ و ہم ردیف ہوں لیکن ردیف کی پابندی ضروری نہیں۔

اردو ادب میں قصیدہ فارسی سے داخل ہوا۔ اردو میں مرزا فرخ سودا اور ابراہیم ذوق جیسے شعرا نے قصیدے کی صنف کو اعلیٰ مقام تک پہنچایا۔ قصیدہ ہیئت کے اعتبار سے غزل سے ملتا ہے بحر شروع سے آخر تک ایک ہی ہوتی ہے پہلے شعر کے دونوں مصرعے اور باقی اشعار کے آخری

مصرعے ہم قافیہ و ہم ردیف ہوتے ہیں۔ مگر قصیدے میں ردیف لازمی نہیں ہے۔ قصیدے کا آغاز مطلع سے ہوتا ہے۔ بعض اوقات درمیان میں بھی مطلع لائے جاتے ہیں ایک قصیدے میں اشعار کی تعداد کم سے کم پانچ ہے زیادہ سے زیادہ کوئی حد مقرر نہیں۔ اردو اور فارسی میں کئی کئی سوا اشعار کے قصیدے بھی ملتے ہیں۔

قصیدہ کی شکل یا ہیئت اور موضوع دونوں کی نوعیت مقررہ ہوتی ہے اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ ان دونوں میں کسی ایک کی عدم موجودگی سے یہ صنف اپنی شناخت کھودیتی ہے۔ غزل جیسی مقبول صنف اس کے بطن سے پیدا ہوئی ہے۔ قصیدہ عربی زبان کا لفظ ہے جس کا معنی ہے ”گاڑھا مغز“۔ اس صنف سخن کو اس نام سے موسوم کرنے کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ وہ اپنے نادر و بلند اور پُرشکوہ مضامین کی وجہ سے تمام اصناف سخن میں ممتاز ہے اور تمام اصناف میں اسے وہی اہمیت حاصل ہے جو انسانی جسم میں مغز سر کو حاصل ہوتی ہے لہذا اسے مغز تصور کر کے ”قصیدہ“ نام دیا گیا ہے۔ قصیدے کی زبان عموماً پُرشکوہ اور لہجہ بلند آہنگ ہوتا ہے۔ قصیدہ میں الفاظ و تراکیب پُررعب اور باوقار ہو، تشبیہات و استعارات کا موزوں استعمال ہو، صنائع بدائع میں جدت طرازی، خیالات کی ندرت اور مبالغہ آمیزی ہو مگر غلو سے گریز بہتر ہے۔ قصیدے میں غزل کے برخلاف خیالات اور مضامین مربوط ہوتے ہیں اس لیے اسے عنوانات سے مزین کیا جاتا ہے۔ جیسے: ”در منقبت حضرت علی“، ”در منقبت امام رضا“، ”در مدح عالم گیر ثانی“ اور ”در مدح آصف الدولہ“ وغیرہ۔

قصیدے کو مختلف مناسبتوں سے مخصوص ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے۔ جیسے:

* آخری لفظ کی مناسبت سے تقسیم:

(۱) لامیہ (۲) لافیہ (۳) میہیہ۔

* ظاہری شکل کے لحاظ سے:

(۱) تمہیدیہ (۲) خطابیہ (۳) وعظیہ (۴) مدحیہ (۵) ہجویہ (۶) بیانیہ (۷) بہاریہ (۸) عشقیہ۔

* تشبیب کے مطابق تقسیم:

(۱) بہاریہ (۲) عشقیہ (۳) حالیہ (۴) فخریہ (۵) دعائیہ۔

★ اجزائے ترکیبی:

(۱) تشبیہ (۲) گریز (۳) مدح (۴) عرض مطلب (۵) دعا۔

اس صنف میں متعدد شعرا نے طبع آزمائی کی لیکن سب سے زیادہ شہرت مرزا محمد رفیع سودا اور شیخ ابراہیم ذوق کے قصائد کو حاصل ہوئی۔ صحیحی نے سودا کو قصیدہ کا نقاش اول، زبان کا حاکم اور جھوکا بادشاہ قرار دیا ہے۔

سلاطین، امرا، عامرانہ حکومتوں اور نوابوں کی نوابی کے خاتمے کے بعد اب قصیدے کے لیے سازگار ماحول نہیں ہے۔ کیوں کہ اب برسر اقتدار حکمران اور وزراء شاعروں کی بجائے کالم نگاروں کی سرپرستی کرنے لگے ہیں۔ اب ہر اخبار میں کوئی نہ کوئی قلم کار کسی نہ کسی کی مدح اور قصیدہ خوانی کر رہا ہے اس لیے رائج صنف کی حیثیت سے قصیدے جیسی اہم صنف کا خاتمہ ہو گیا ہے۔

قصیدہ در منقبت حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم

(مرزا اسد اللہ خاں غالب)

دہر جز جلو یکتائے معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود ہیں
بے دلی ہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق
بے کسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں
ہرزہ ہے نغمہ زیر و بم ہستی و عدم
لغو ہے آئینہ فرق جنون و تمکلیں
نقش معنی ہمہ خمیازہ عرض صورت
سخن حق ہمہ پیمانہ ذوق تحسین
لاف دانش غلط و نفع عبادت معلوم!
درد یک ساغر غفلت ہے چہ دنیا و چہ دیں
مثل مضمون وفا باد بدست تسلیم

صورت نقش قدم خاک بہ فرق تمکلیں
عشق بے ربطی شیرازہ اجزائے حواس
وصل، زنگار رخ، آئینہ حسن یقیں
کوہ کن، گرسنہ مزدورِ طرب گاہ رقیب
بے ستوں، آئینہ خوابِ گرانِ شیریں
کس نے دیکھا نفسِ اہل وفا آتش خیز
کس نے پایا اثرِ نالہ دل ہائے حزیں!
سامع زمزمہ اہل جہاں ہوں لیکن
نہ سر و برگ ستائش، نہ دماغِ نفریں
کس قدر ہرزہ سرا ہوں کہ عیاذاً باللہ
یک قلم خارجِ آدابِ وقار و تمکلیں
نقش لاحول لکھ اے خامہ ہدیاں تحریر
یا علی عرض کر اے فطرتِ وسواسِ قرین
مظہر فیضِ خدا، جان و دل ختمِ رسل
قبلہ آلِ نبی کعبہ ایجاد یقیں
ہو وہ سرمایہ ایجاد جہاں گرمِ خرام
ہر کفِ خاک ہے واں گردہ تصویرِ زمیں
جلوہ پرداز ہو نقشِ قدم اس کا جس جا
وہ کفِ خاک ہے ناموسِ دو عالم کی امیں
نسبتِ نام سے اس کی ہے یہ رُتبہ کہ رہے
ابدأ پشیتِ فلک خم شدہ نازِ زمیں
فیضِ خلق اس کا ہی شامل ہے کہ ہوتا ہے سدا
بوئے گل سے نفسِ بادِ صبا عطر آگین

بُرش تیغ کا اس کی ہے جہاں میں چرچا
 قطع ہو جائے نہ سرِ رشقہ ایجاد کہیں
 کفر سوز اس کا وہ جلوہ ہے کہ جس سے ٹوٹے
 رنگِ عاشق کی طرح رونقِ بت خانہ چیں
 جاں پناہ! دل و جاں فیضِ رسانا! شاہا!
 وصیِ ختمِ رسل تو ہے بہ فتوائے یقیں
 جسمِ اطہر کو ترے دوشِ پیہرِ منبر
 نامِ نامی کو ترے ناصیہِ عرشِ نگین
 کس سے ممکن ہے تری مدحِ بغیر از واجب
 شعلہٴ شمع مگر شمع پہ باندھے آئیں
 آستاں پر ہے ترے جوہرِ آئینہٴ سنگ
 رقمِ بندگی حضرتِ جبریلِ امین
 تیرے در کے لیے اسبابِ نثارِ آمادہ
 خاکِ یوں کو جو خدا نے دیے جان و دل و دیں
 تیری مدحت کے لیے ہیں دل و جاں کام و زباں
 تیری تسلیم کو ہیں لوح و قلم دست و جبین
 کس سے ہو سکتی ہے مداحیِ ممدوحِ خدا
 کس سے ہو سکتی ہے آرائشِ فردوسِ بریں!
 جنسِ بازارِ معاصیِ اسد اللہ اسد
 کہ سوا تیرے کوئی اس کا خریدار نہیں
 شوخیِ عرضِ مطالب میں ہے گستاخِ طلب
 ہے ترے حوصلہٴ فضل پہ از بس کہ یقیں
 دے دعا کو مری وہ مرتبہٴ حسنِ قبول

کہ اجابت کہے ہر حرف پہ سو بار آئیں
 غمِ شبیر سے ہو سینہ یہاں تک لبریز
 کہ رہیں خونِ جگر سے مری آنکھیں رنگیں
 طبع کو الفتِ دلدل میں یہ سرگرمِ شوق
 کہ جہاں تک چلے اس سے قدم اور مجھ سے جبین
 دلِ الفتِ نسب و سینہٴ توحیدِ فضا
 نگہِ جلوہ پرست و نفسِ صدقِ گزین
 صرفِ اعدا اثرِ شعلہٴ دودِ دوزخ
 وقفِ احبابِ گل و سنبلِ فردوسِ بریں

(۷) مرثیہ:

مرثیہ عربی لفظ ”رثا“ سے مشتق ہے جس کے معنی بگا اور بین کرنے کے ہیں۔ مرثیہ شاعری کی ایسی صنف کو کہا جاتا ہے جس میں کسی کی وفات پر اظہارِ غم اور مرنے والے کے اوصاف بیان کیے جائیں یعنی مرنے والے کے لیے رونا اور اس کی خوبیاں بیان کرنا مرثیہ کہلاتا ہے۔ یہ اردو کی مقبول صنفِ سخن ہے۔ اس میں ابتدائی سے توجہ کی گئی۔ قدیم اردو یا دکنی کے کم و بیش تمام شاعروں نے مرثیہ لکھے۔ مرثیہ کی صنفِ عربی سے فارسی اور فارسی سے اردو میں آئی۔ لیکن اردو اور فارسی میں مرثیہ کی صنف زیادہ تر اہل بیت یا واقعہ کربلا کے لیے مخصوص ہے۔ لیکن اس کے علاوہ بھی بہت سی عظیم شخصیات کے مرثیہ لکھے گئے ہیں۔ اردو میں مرثیہ کی ابتدا دکن سے ہوئی۔ دکن میں عادل شاہی اور قطب شاہی سلطنتوں کے بانی اپنے یہاں امام باڑوں میں مرثیہ خوانی کرواتے تھے۔ اردو کا سب سے پہلا مرثیہ گو دکنی شاعر ”ملا وجہی“ تھا۔ لکھنؤ میں اس صنف کو مزید ترقی ملی اور میر انیس اور میر دبیر جیسے شعرا نے مرثیہ کو اعلیٰ مقام عطا کیا۔ مرثیہ کا زیادہ استعمال واقعہ کربلا کو بیان کرنے میں ہوتا ہے۔ جدید تنقیدی

بصیرت کی رُو سے مرثیہ گوئی کو فن شاعری کا سب سے حساس اور کٹھن عمل قرار دیا گیا ہے۔
باریک بین افراد جانتے ہیں کہ کئی اصنافِ سخن پر فنی گرفت رکھے بغیر ایک فکر انگیز اور جاندار
مرثیہ نہیں کہا جاسکتا۔ شعر پر فنی گرفت کے ہمراہ جتنی فصاحتِ کلام، بلاغت، حساسیت اور علمی
و فکری مواد پر دسترس کی ایک کامیاب مرثیہ نگار کو ضرورت ہوتی ہے اتنی سعی نقد کسی اور صنفِ
سخن میں مطلوب نہیں ہوتی۔

عام طور پر مرثیے واقعات کر بلا پر مبنی ہوتے ہیں اس میں سیدنا امام حسین رضی
اللہ عنہ، آپ کے جاں نثاروں اور خاندانِ حسین کی سیرت، شخصیت، کردار، جذبات،
احساسات، اعزہ سے رخصتی، میدان کارزار میں ان فدائیانِ حسین کی آمد، آلاتِ حرب و
ضرب، جنگ کا منظر، گھوڑوں کی تیزی، تلواروں و نیزوں کی چمک دمک، فرات کے
کنارے پر دشمن کی فوج کے پھرے، پیاسوں کی شہادت اور پھر ان کے زخمی لاشوں پر
بین و بکا وغیرہ۔ سودا، انیس اور دبیر جیسے شعرا نے مرثیے کو جس بلندی پر پہنچایا وہ اپنی
مثال آپ ہے۔ اردو میں غیر مذہبی، شخصی اور قومی مرثیوں کی بھی کمی نہیں۔ شخصی مرثیوں
میں حالی، اقبال، سرور جہاں آبادی، چلبست اور صغریٰ لکھنوی کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان
شعرا نے مختلف علمی، ادبی اور سیاسی شخصیتوں کی وفات پر مرثیے لکھے ہیں۔

☆ **قصیدہ کی اقسام:** (۱) شخصی (۲) قومی (۳) کر بلائی۔

☆ **اجزائے ترکیبی:** (۱) چہرہ (۲) سراپا (۳) رخصت (۴) آمد (۵) رجز (۶)
رزم (۷) شہادت (۸) بین۔

یہاں مرزا سلامت علی دبیر کے مرثیہ کے چند بند بطور نمونہ پیش ہے۔

ہاتھوں پہ لے کے اس کو چلے شاہ کر بلا
اور ساتھ ساتھ گود کو کھولے ہوئے قضا
لکھا ہے دھوپ تیز تھی اور گرم تھی ہوا
اصغر پہ ماں نے ڈال دی اجلی سی اک ردا

چادر نہ تھی وہ چہرہ پر آب و تاب پر
ٹکڑا سفید ابر کا تھا آفتاب پر

ہر اک قدم پہ سوچتے تھے سبٹ مصطفیٰ
لے تو چلا ہوں فوجِ عمر سے کہوں گا کیا
پانی کے واسطے نہ کروں گا میں التجا
منت کروں گا بھی تو سنیں گے تو نہ اشقیاء
کم ظرف سنگدل ہیں یہ کیا رحم کھائیں گے
مجھ کو یقین نہیں ہے کہ پانی پلائیں گے

پہنچے قریب فوج تو گھبرا کے رہ گئے
چاہا کریں سوال پہ شرما کے رہ گئے
غیرت سے رنگ فق ہوا تھرا کے رہ گئے
چادر پسر کے چہرے سے سرکا کے رہ گئے
آنکھیں جھکا کے بولے کہ یہ ہم کو لائے ہیں
اصغر تمہارے پاس غرض لے کے آئے ہیں

ماں نے بہت گلے سے لگایا نہ چپ ہوئے
بہنوں نے گودیوں میں کھلایا نہ چپ ہوئے
گہوارے میں پھوپھی نے جھلایا نہ چپ ہوئے
رو رو کے سارے گھر کو رُلایا نہ چپ ہوئے
واں اشک بار تھے تو یہاں بے قرار ہیں

پانی کے تم سبھوں سے یہ اُمیدوار ہیں

گر میں بقولِ شمر و عمر ہوں گناہ گار
یہ تو نہیں کسی کے بھی آگے قصوروار
شش ماہہ ، بے زبان، نبی زادہ، شیر خوار
ہفتم سے سب کے ساتھ یہ پیاسا ہے بیقرار
سن ہے جو کم تو پیاس کا صدمہ زیادہ ہے
مظلوم خود ہے اور یہ مظلوم زادہ ہے

پھر ہونٹ بے زبان کے چومے جھکا کے سر
رو کر کہا جو کہتا تھا سو کہہ چکا پد
باقی رہی نہ بات کوئی اے مرے پسر
سوکھی زبان تم بھی دکھا دو نکال کر
پھیری زباں لبوں پہ جو اس نور عین نے
تھرا کے آسمان کو دیکھا حسین نے

مولا فلک کو دیکھ رہے تھے کہ ناگہاں
لی حرمہ نے شانے سے دو ٹانک کی کماں
ترکش سے چن کے کھینچ لیا تیرے جاں ستاں
جوڑا کماں میں تاک کے حلقوم بے زباں
چھٹنے ہی حلق بچے کا چھیدا جو تیرنے
گھبرا کے غش سے کھول دیں آنکھیں صغیر نے

(۸) شہر آشوب:

شہر آشوب فارسی، ترکی اور اردو ادب کی ایک اہم صنفِ سخن ہے۔ ایسی صنف جو غمِ جاناں سے آگے نکل کر غمِ دوراں کا احاطہ کرتی ہے۔ گردشِ زمانہ، سلطنتوں، بادشاہوں، امیروں اور حکمرانوں کے سیاسی وقار کا زوال، عوام و خواص کے معاشی حالات، پستی اور زبوں حالی، فوجوں کی شکست، درباروں اور محلوں کا اُجڑنا، معاشی کساد بازاری، مختلف پیشوں میں کاروبار کا فقدان، آمدنی اور کمائی میں کمی اور اس کے ساتھ ساتھ سماجی گراؤ، افسوس ناک حالات کا وقوع پذیر ہونا، اقدار کا ٹوٹنا، یہ صنف ایسی تمام صورتوں کا جائزہ لیتی ہے جو صنفی اور فنی تمام خوبیوں کے ساتھ ساتھ ہر زندہ ادب کی طرح اپنے عہد کی عصری حسیت کی عکاسی بھی کرتی ہے اور اپنے دور کی بدلتی ہوئی قدروں، بدلتے ہوئے ادوار اور بنتے بگڑتے ہوئے حالات کی نہ صرف ترجمان ہوتی ہے بلکہ اس دور کی روح کو اپنے اندر سمو لیتی ہے۔

شہر آشوب اردو کی وہ کلاسیکی صنفِ سخن ہے جس میں ہیئت کی کسی خاص پابندی کے بغیر سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی بحران کی وجہ سے عوام و خواص کی بربادی کا حال بیان کیا گیا ہو یا ایسی نظم جس میں کسی شہر یا ملک کی اقتصادی یا سیاسی بے چینی کا تذکرہ ہو یا شہر کے مختلف طبقوں کی مجلسی زندگی کے پہلو کا نقشہ خصوصاً ہزلیہ، طنزیہ یا ہجو یہ انداز میں کھینچا گیا ہو ”شہر آشوب“ کہلاتی ہے۔ اردو میں شہر آشوب کا آغاز اٹھارہویں صدی عیسوی میں شروع ہوا۔ حضرت اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ (۱۷۰۷ء) کی وفات کے بعد ہر طرف زوال و ادبار کے مہیب سائے منڈلانے لگے۔ چنانچہ جو صنفِ سخن فارسی اور ترکی میں ذہنی انبساط کے حصول کے لیے مخصوص تھی وہ اردو میں سیاسی، معاشی اور معاشرتی اختلاج کے بیان کا ذریعہ بن گئی۔ اردو کی پہلی آشوبیہ نظم کا مصنف میر جعفر زٹی (متوفی ۱۷۱۲ء) ہے اس کے بعد شاکر ناجی، ظہور الدین حاتم، مرزا محمد رفیع سودا اور میر تقی میر وغیرہ کا نمبر آتا ہے اور آشوب گوئی کا یہ سلسلہ ۱۸۵۷ء تک جاری رہتا ہے۔

ہے خاک جیسے ریگ رواں سب نہ آب ہے
دریاے موج خیز جہاں کا سراب ہے

سچ ہے ہمیں کو آپ کے شکوے بجا نہ تھے
 بے شک ستم جناب کے سب دوستانہ تھے
 ہاں جو جفا بھی آپ نے کی قاعدے سے کی
 ہاں ہم ہی کاربند اصول وفا نہ تھے
 لب پر ہے تلخی مئے ایام ورنہ فیض
 ہم تلخی کلام پہ مائل ذرا نہ تھے

(۱۰) ریختی:

”ریختی“ مردوں کے ذریعہ عورتوں کی مخصوص زبان، محاورے اور روزمرہ میں عورتوں کے باہمی معاملات اور جنسی جذبات کے اظہار پر مبنی شاعری ہے جو غزل کی ہیئت میں لکھی جاتی ہے مگر اس کا انداز، طرز، لہجہ حتیٰ کہ زبان و بیان غزل سے قطعاً مختلف بلکہ متضاد ہوتا ہے۔ بعض شعرا نے مستزاد کی ہیئت میں بھی ریختی لکھی ہے۔

ریختی انیسویں صدی میں لکھنؤ کے خاص ثقافتی ماحول کی پیداوار تھی۔ اس کے اہم شاعروں میں یار علی جان صاحب، سعادت یار خاں رنگین، محسن خاں محسن اور انشا اللہ خاں انشا شامل ہیں۔ آج یہ صنف تقریباً ختم ہو چکی ہے۔ میر یار علی جان کا ایک ریختی کلام پڑھیے۔

چنگیز خاں سے کم نہیں خوں خوار کا مزاج
 دشمن کا ہو نہ جو ہے مرے یار کا مزاج
 اے جان دل حرام سے پرہیز کیا کرے
 رہتا نہیں ہے قابو میں بیمار کا مزاج

روز شمار میں بھی محاسب ہے گر کوئی
 تو بے حساب کچھ نہ کر آخر حساب ہے
 اس شہر دل کو تو بھی جو دیکھے تو اب کہے
 کیا جانے کہ بستی یہ کب کی خراب ہے
 منہ پر لیے نقاب تو اے ماہ کیا چھپے
 آشوب شہر حسن ترا آفتاب ہے
 کس رشک گل کی باغ میں زلف سیہ کھلی
 موج ہوا میں آج نپٹ پیچ و تاب ہے
 کیا دل مجھے بہشت میں لے جائے گا بھلا
 جس کے سبب یہ جان پہ میری عذاب ہے
 سن کان کھول کر کہ تک جلد آنکھ کھول
 غافل یہ زندگانی فسانہ ہے خواب ہے
 آتش ہے سوز سینہ ہمارا مگر کہ میر
 نامے سے عاشقوں کے کبوتر کباب ہے

(۹) واسوخت:

ایسے اشعار جو بطور مسدس، ترجیح بند یا ترکیب بند، معشوق سے جل کر اس کی شکایت، عشق کی برائی آئندہ کے لیے اپنی بے پروائی اور بیزاری میں لکھے جائیں۔ واسوخت میں شاعر خصوصیت کے ساتھ معشوق کی بے وفائی اور بے رنجی سے تنگ آکر محبوب اور عشق سے بے زاری کا اظہار کرتا ہے۔ محبوب کو اس اُمید پر جلی کٹی سنا تا ہے کہ شاید وہ مائل بہ التفات ہو جائے اور عاشق کے شکوؤں کا مداوا کرے۔ چنانچہ عاشق مختلف حیلوں بہانوں سے معشوق کو دھمکاتا ہے کہ اگر ستم شعاریاں باقی رہیں تو صبر کا دامن چھوٹ جائے گا اور وہ اس سے علاحدگی اختیار کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔

(۱۱) پیروڈی:

پیروڈی لفظ پیروڈیا سے نکلا ہے۔ جس کے معنی ہیں جوانی نغمہ۔ ایک ادبی طرز تخلیق جس میں کسی نظم یا نثر کی نقل کر کے مزاح کارنگ پیدا کیا جاتا ہے۔ اصطلاح میں اس سے وہ صنف ظرافت (نظم و نثر) مراد ہے جو کسی کے طرز نگارش کی طرز اور نقل میں لکھی گئی ہو اور اصل نگارش کے الفاظ و خیالات کو اس طرح بدل دیا جائے کہ مزاحیہ تاثرات پیدا ہو جائیں۔ بعض اوقات صرف ایک لفظ بدل دیا جاتا ہے اور کبھی کبھی ایک حرف یا حرکت کی تبدیلی سے بھی پیروڈی ہوجاتی ہے۔ پیروڈی کے لیے ضروری ہے کہ جس نظم و نثر کی پیروڈی ہو وہ مشہور و معروف ہوتا کہ قاری فوراً پہچان لے اور اس سے بھرپور حظ اٹھا سکے۔ پیروڈی کو مضحکہ خیز لفظی تصرف یا لفظی نقالی بھی کہہ سکتے ہیں۔ ابن انشا کی مشہور غزل ملاحظہ فرمائیں۔

کل چودہویں کی رات تھی شب بھر رہا چرچا ترا
کچھ نے کہا یہ چاند ہے کچھ نے کہا چہرا ترا
کوچے کو تیرے چھوڑ کر جوگی ہی بن جائیں مگر
جنگل ترے، پر بت ترے، بستی تری، صحرا ترا
اس شہر میں کس سے ملیں ہم سے تو چھوٹی محفلیں
ہر شخص تیرا نام لے، ہر شخص دیوانہ ترا
ابن انشا کی اس غزل کی سعدیہ حریم نے بہت خوب پیروڈی کی ہے۔

کل رات نکلی تھی پولس شب بھر کیا پیچھا ترا
معلوم تھا سب کو مگر پکڑا نہ پر سایہ ترا
دھندہ کرے کوئی تو کیا ہر شے پہ ہے قبضہ ترا
دفتر ترے، افسر ترے، موٹر تری، بنگلہ ترا

اس شہر میں کس سے ملیں ہم سے تو چھوٹیں محفلیں
ہر شخص کرتا ہے طلب بھولا ہوا قرضہ ترا
اردو ادب میں ابن انشا کی تصنیف ”اردو کی آخری کتاب“ پیروڈی کی بہترین مثال ہے۔

(۱۲) گیت:

لغت میں گیت سے مراد ”راگ“ ”سرور“ اور ”نغمہ“ کے ہیں اس لیے گیت کو گانے کی چیز سمجھا جاتا ہے۔ اس کا گہر تعلق موسیقی سے ہے اس لیے اس میں سُرا ورتال کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ گیت میں جذبات و احساسات اور خاص کر ہجر و فراق کو بڑے والہانہ انداز میں بیان کیا جاتا ہے۔ موسیقی میں گیت سروں کی ایک ایسی لہر ہوتی ہے جس میں انسانی آواز بھی شامل ہو اور وہ گیت کے بول گائے۔ گیت کو گایا جاتا ہے اور انسانی آواز جو کہ سُرا میں ادا کی جاتی ہے، اس کے ساتھ آلات موسیقی کا استعمال بھی کیا جاتا ہے۔ بعض گیت ایسے بھی ہیں جن میں آلات موسیقی کا استعمال ممنوع ہوتا ہے اور گیت کے تمام تر جزئیات انسانی آواز پر مشتمل ہوتے ہیں۔ گیت کے بول عام طور پر شاعری پر مشتمل ہوتے ہیں اور ان کو ادا کرتے ہوئے سُرا ورتال کا تمام تر احترام ملحوظ خاطر رکھا جاتا ہے۔ گیت کو یا تو ایک ہی گانک (سنگر) گاتا ہے یا پھر مرکزی گلوکار کے ساتھ کئی دوسری آوازیں بھی شامل ہوتی ہیں جو کہ سُرا کو اٹھانے اور اس کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے شامل کی جاتی ہیں۔ دوسرے گانک عام طور پر بار بار دہرائے جانے والے گیت کے بول ادا کرتے ہیں یا پھر مرکزی گلوکار کے ہم آواز سُرا کو جلا بخشتے ہیں۔ فلمی صنعت کی وجہ سے اس صنف کو بہت شہرت ملی ہے۔

گیت کی کئی قسمیں ہیں جو کہ شاعری، آواز اور خطوں کی بنیاد پر درجہ بندی میں ڈھالی جاتی ہیں۔ لطیف گیت، کلاسیکی گیت، پاپ گیت یا پھر لوک گیت۔ اس کے علاوہ گیتوں کی درجہ بندی موسیقی کی صنف اور گیت کے مقصد کے تحت بھی کی جاتی ہے جیسے کہ ڈانس، ریپ، جاز، کنٹری وغیرہ۔

بہ طور مثال بیکل اتساہی کا گیت ”میں کس کے گیت لکھوں“ سے دو بند۔

ہیئت کے اعتبار سے تقسیم:

ہیئت کے لحاظ سے اردو شاعری کی سات قسمیں بتائی جاتی ہیں۔

(۱) مثنوی (۲) رباعی (۳) قطعہ (۴) مُسمط (۵) ترکیب بند (۶) ترجیع بند (۷) نظم ☆ پابند نظم ☆ معری نظم ☆ آزاد نظم (۸) سانیٹ (۹) تراخیلے (۱۰) ہائیکو (۱۱) نثری شاعری۔

(۱) مثنوی:

مثنوی اس نظم کو کہتے ہیں جو مسلسل ہو اور اس میں کوئی واقعہ یا داستان وغیرہ نظم یا رقم کی جاتی ہے اور رزمیہ، بزمیہ، صوفیانہ یا اخلاقی مضامین باندھے جاتے ہیں۔ لفظ مثنوی عربی زبان کا لفظ ہے۔ یہ مثنوی سے مشتق ہے جس کے معنی دو، دو کیا گیا یا دو، دو کے ہے۔ اس کے ہر شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں اور ہر شعر کا قافیہ دوسرے اشعار کے قافیے سے مختلف ہوتا ہے۔ مثنوی کے اشعار ایک ہی بحر میں ہوتے ہیں۔ چوں کہ ہر شعر کا قافیہ دوسرے اشعار کے قافیے سے مختلف ہوتا ہے اور ہر شعر میں دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں اس لیے اس کو مثنوی نام دیا گیا ہے۔

مثنوی کی ابتدا ایران میں ہوئی۔ شاہنامہ فردوسی اور مثنوی مولانا روم فارسی کی بے مثال مثنویاں ہیں۔ شاعری کی دیگر اصناف میں مثنوی کو اس کی بعض خوبیوں کی وجہ سے فوقیت اور برتری حاصل ہے۔ چنانچہ حالی کہتے ہیں: ”مثنوی سب سے زیادہ مفید اور کارآمد صنف ہے۔“ اردو میں قدیم دکنی شعرا کے کرام نے مثنوی کی داغ بیل ڈالی۔ دکن میں سب سے پہلی مثنوی فخر الدین نظامی کی ”کدم راؤ پدم راؤ“ ملتی ہے۔ قطب مشتری (ملا وجہی)، گلشن عشق (نصرتی)، علی نامہ (نصرتی)، پھول بن (ابن نشاطی)، سحر الیمان (میر حسن)، گلزار نسیم (دیاشنکر نسیم) اور زہر عشق (شوق لکھنوی) چند مشہور و معروف مثنویاں ہیں۔

دکن کے چند ممتاز مثنوی نگار شعرا میں اشرف بیابانی، میراں جی شمس العشاق،

صحرا صحرا من کا چرچا ، گلشن گلشن جنگ
میں کس کے گیت لکھوں
ڈالی ڈالی پھول پھول پر کروٹ لیں انکارے
شبم شبم ، پتی پتی ، شعلے بانہہ پَسارے
سانسوں سانسوں قید ہے خوشبو ، آنکھوں آنکھوں رنگ
میں کس کے گیت لکھوں

بجر بنجر جشن بہاراں ، کھیت کھیت ویرانے
جھونپڑیوں میں پیاس چھلکتی مخلوں میں پیانے
باہر باہر چم چم چمکے بھیتر بھیتر زنگ
میں کس کے گیت لکھوں

(۱۳) ہجو:

ایسا کلام یا ایسی نظم خواہ کسی بھی ہیئت میں ہو۔ جس میں کسی کی مخالفت میں اس پر طنز کیا جائے یا اس کا مذاق اڑایا جائے۔ اردو ادب میں میر کی ہجویات اور سودا کی ہجویات مشہور ہیں۔ پہلے ”ہجو“ کو قصیدے کے ضمن میں گردانا جاتا تھا مگر اب یہ اپنے لیے ایک علاحدہ شناخت بنا چکی ہے۔ آج کل سیاسی جلسوں میں ہجو گو شعرا کی بڑی پذیرائی ہوتی ہے۔ مرزا محمد رفیع سودا نے میر تقی میر کی ہجو میں جو اشعار کہے ہیں وہ کامیاب اور فنکارانہ طنز کی بہترین مثال ہے۔ نوا اشعار کی اس ہجو میں جو واقعہ ہوا ہے اس کا انحصار آخری شعر پر ہے۔

ہر ورق پر ہے میر کی اصلاح
لوگ کہتے ہیں سہو کاتب ہے

اس میں فنی تعمیر اتنی منظم اور اشعار ایک دوسرے سے اس قدر مربوط ہیں کہ اس آخری شعر کا وارثیابی ہو جاتا ہے۔ بغیر سخت الفاظ استعمال کیے ایسی ہجو خود سودا نے دوسری نہیں کہی۔

وجہی، غواصی، ابن نشاطی، نصرتی اور ہاشمی کے نام قابل ذکر ہیں۔

شمالی ہند کے مشہور شعرا میں میر تقی میر، خواجہ میر انور، میر حسن، دیاشکر نسیم اور مرزا

شوق کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

☆ **اجزائے ترکیبی:** (۱) پلاٹ (۲) کردار (۳) منظر نگاری (۴) واقعہ نگاری

(۵) زبان اور طرز ادا

☆ **مثنوی کی قسمیں:** (۱) توضیحی (۲) بیانیہ۔

☆ **موضوع کے اعتبار سے قسمیں:** (۱) بزمیہ (۲) رزمیہ۔

(۲) رباعی:

رباعی عربی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی چار چار کے ہیں۔ شاعرانہ مضمون میں رباعی اس صنف کا نام ہے جس میں چار مصرعوں میں ایک مکمل مضمون ادا کیا جاتا ہے۔ رباعی کا وزن مخصوص ہے، پہلے دوسرے اور چوتھے مصرعے میں قافیہ لانا ضروری ہے۔ تیسرے مصرعے میں اگر قافیہ لایا جائے تو کوئی عیب نہیں۔ اس کے موضوعات مقرر نہیں۔ اردو فارسی کے شعرا نے ہر نوع کے خیال کو اس میں سمویا ہے۔ رباعی کے آخری دو مصرعے خاص کر چوتھے مصرعے پر ساری رباعی کا حسن و اثر اور زور کا انحصار ہے۔ چنانچہ علمائے ادب اور فصحاء سخن نے ان امور کو ضروری قرار دیا ہے۔ بعض نے رباعی کے لیے چند معنوی و لفظی خصوصیات کو بھی لازم گردانا ہے۔ عروض کی مختلف کتابوں میں رباعی کے مختلف نام ہیں۔ رباعی، ترانہ اور دو بیتی بعض نے چہار مصرعی، جفتی اور خصی بھی لکھا ہے۔ مولانا احمد رضا کی ایک رباعی ملاحظہ فرمائیں۔

اللہ کی سر تا بقدم شان ہیں یہ
ان سا نہیں انسان وہ انسان ہیں یہ
قرآن تو ایمان بتاتا ہے انہیں
ایمان یہ کہتا ہے مری جان ہیں یہ

(۳) قطعہ:

قطعہ شاعری کی ایک صنف ہے یہ چار مصرعوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ دو شعروں کے مجموعے کو قطعہ کہتے ہیں۔ اس کے پہلے مصرعے میں قافیہ یا ردیف کی کوئی قید نہیں ہے لیکن دوسرے مصرعے میں قافیہ لازمی موجود ہوتا ہے اس کے بعد اگر ردیف بھی لگا دیا جائے تو مصنف کی مرضی ہے ورنہ ردیف کے بغیر بھی قطعہ کے اصول مکمل ہو جاتے ہیں لیکن قافیہ ضروری ہے پہلے دو مصرعوں کے بعد تیسرا مصرعے آتا ہے اس میں بھی قافیہ اور ردیف کی کوئی قید نہیں لیکن چوتھے اور آخری مصرعے میں دوسرے مصرعے کا ہم آواز قافیہ ضروری ہوتا ہے اور دوسرے مصرعے کے مطابق اگر قافیہ کے ساتھ ردیف ہے تو وہی ردیف چھوٹے مصرعے میں قافیہ کے بعد اس طرح لکھا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ قطعہ اس طرح بھی لکھا جاتا ہے کہ پہلے دونوں مصرعوں میں قافیہ یا قافیے کے ساتھ ردیف لگایا جائے مگر تیسرے مصرعے کو قافیہ اور ردیف سے آزاد رکھا جائے مگر آخری مصرعے یعنی چوتھے مصرعے میں پہلے دو مصرعوں کا ہم آواز قافیہ اور وہی ردیف لگایا جاتا ہے۔ ذوق کا ایک قطعہ یہ طور نمونہ۔

اے ذوق، بس نہ آپ کو صوفی جتائیے
معلوم ہے حقیقتِ شو حق جناب کی
نکلے ہوئے کدے سے ابھی منہ چھپا کے تم
دابے ہوئے بغل میں صراحی شراب کی

(۴) مسمط:

مسمط عربی زبان کا لفظ ہے۔ اس کے لغوی معنی ہیں پردئی ہوئی اور جڑی ہوئی چیز۔ مسمط ایک صنائع لفظی بھی ہے جس کی تعریف یہ ہے کہ جب شاعر کسی شعر میں اصل قافیہ کے علاوہ تین مسجع یا ہم وزن فقرے یا قافیہ مزید نظم کرے تو اسے صنعت مسمط کہتے ہیں۔

اصطلاح شعر میں اس سے مراد وہ نظم ہے جس کا ہر بند ایک مقررہ تعداد کے مصرعوں پر مشتمل ہو۔ ایک بند میں تین مصرعوں سے لے کر دس مصرعوں تک ہو سکتے ہیں۔ اس طرح مصرعوں کی گنتی کے لحاظ سے مسمط کی آٹھ قسمیں بنتی ہیں۔ جن میں چار قسمیں مثلث، مربع، مخمس اور مسدس عام طور پر مستعمل ہیں۔ یعنی جن کا ہر بند بالترتیب تین، چار، پانچ اور چھ مصرعوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ مولانا الطاف حسین حالی کی مشہور نظم ”مدو جزر اسلام“ مسدس ہیئت میں ہے جو ”مسدس“ حالی کے نام سے موسوم ہے۔ اس طرح ڈاکٹر اقبال کی شہرہ آفاق نظمیں ”شکوہ اور جواب شکوہ“ بھی مسدس ہیئت میں ہیں۔ بیشتر مرثیے بھی اسی ہیئت میں لکھے گئے ہیں۔

”جواب شکوہ“ کے اشعار بطور نمونہ ملاحظہ فرمائیں۔

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پر نہیں، طاقت پرواز مگر رکھتی ہے
قدسی الاصل ہے، رفعت پر نظر رکھتی ہے
خاک سے اٹھتی ہے، گردوں پہ گزر رکھتی ہے
عشق تھا فتنہ گرو سرکش و چالاک مرا
آسماں چیر گیا نالہ بیباک مرا

(۵) ترکیب بند:

وہ نظم جس میں مسلسل چھ سے آٹھ شعر ہوتے ہیں۔ ساتویں یا آٹھویں شعر کے دو مصرعے گرہ کے طور پر علاحدہ قافیہ کے لکھے جاتے ہیں جبکہ ہر بند کے قافیہ وردیف مختلف ہوتے ہیں۔

نمونے کے طور پر علامہ اقبال کی نظم ”طلوع اسلام“ سے ایک بند
خدائے لم یزل کا دست قدرت تو، زبان تو ہے
یقین پیدا کر اے غافل کہ مغلوب گماں تو ہے

پرے ہے چرخ نیلی فام سے منزل مسلمان کی
ستارے جن کی گردِ راہ ہوں، وہ کارواں تو ہے
مکاں فانی، مکین آنی، ازل تیرا، ابد تیرا
خدا کا آخری پیغام ہے تو، جاوداں تو ہے
حننا بند عروسِ لالہ ہے خون جگر تیرا
تری نسبت برا ہی ہے معمارِ جہاں تو ہے!
تری فطرت امیں ہے، ممکناتِ زندگانی کی
جہاں کے جوہر مضمحل کا گویا امتحان تو ہے!
جہاں آب و گل سے عالم جاوید کی خاطر
بنوت ساتھ جس کو لے گئی، وہ ارمغان تو ہے
یہ نکتہ سرگذشتِ ملت بیضا سے ہے پیدا
کہ اقوام زمین ایشیا کا پاسبان تو ہے
سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

(۶) ترجیع بند:

یہ بھی ترکیب بند کی طرح ہوتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اس میں آخری گرہ کے شعر یا مصرعہ ہر بند میں بار بار دہرایا جاتا ہے جسے ٹیپ کا شعر کہتے ہیں جب کہ ترکیب بند میں ہر ٹیپ میں نیا شعر ہوتا ہے۔

ترجیع بند کی مثال میں مولانا جمیل الرحمن قادری کا ایک کلام۔
نہ کیوں کر مدینے پہ مکہ ہو قرباں
کہ ہیں جلوہ گر اُس میں محبوبِ یزداں

برستے ہیں ہر وقت انوارِ سبحان
ہے ہر ایک گوشہ وہاں کا گلستاں
عجب دل کشا ہے مدینے کی گلیاں
معطر ہیں یوں جیسے پھولوں کی گلیاں

وہ گلیاں جہاں پر ملک سر جھکائیں
وہ گلیاں کہ عاشق کے دل میں سمائیں
وہ گلیاں کہ ہیں جن کی پیاری ادائیں
کسی کو ہنسائیں کسی کو رلائیں
عجب دل کشا ہے مدینے کی گلیاں
معطر ہیں یوں جیسے پھولوں کی گلیاں

(۷) نظم:

نظم کا لفظ عام طور سے نثر کے مقابلے میں استعمال کیا جاتا ہے اور جملہ اصنافِ شاعری کو بھی ”نظم“ ہی کہتے ہیں۔ اس اعتبار سے قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، غزل، رباعی اور دیگر اصنافِ شعری نظم کے تحت آتے ہیں۔ اسی طرح شاعری کی محض ایک صنف کو بھی ”نظم“ کہتے ہیں جسے عام طور پر غزل کے مقابلے میں پیش کیا جاتا ہے۔ غزل کے برخلاف نظم کی ہیئت مخصوص نہیں ہوتی لیکن اس کے اشعار میں خیال یعنی مضمون کا تسلسل پایا جاتا ہے کیوں کہ نظم کسی ایک موضوع پر کہی جاتی ہے۔ نظیر اکبر آبادی، محمد حسین آزاد، الطاف حسین حالی، اسماعیل میرٹھی، چکبست، سرور جہاں آبادی، اقبال، جوش اور متعدد شعرا نے نظم نگاری کو فروغ دیا۔

آدمی نامہ

از: نظیر اکبر آبادی

دنیا میں بادشا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی
اور مفلس و گدا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی
زردار، بے نوا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی
نعمت جو کھا رہا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی
کلڑے جو مانگتا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی
ابدال و قطب و غوث و ولی آدمی ہوئے
منکر بھی آدمی ہوئے اور کفر کے بھرے
کیا کیا کرشمے، کشف و کرامات کے کیے
حتیٰ کے اپنے زہد و ریاضت کے زور سے
خالق سے جا ملا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی
فرعون نے کیا تھا جو دعویٰ خدائی کا
شداد بھی بہشت بنا کر ہوا خدا
نمرود بھی خدا ہی کہتا تھا بر ملا
یہ بات ہے سمجھنے کی، آگے کہوں میں کیا
یاں تک جو ہو چکا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی
اردو نظم کی ہیئت کے اعتبار سے تین اہم قسمیں ہیں۔ پابند نظم، نظم معریٰ اور آزاد نظم۔

☆ پابند نظم:

پابند نظم میں بحر و قافیہ کی پابندی کی جاتی ہے۔ اس کے سارے مصرعے ایک ہی بحر میں ہوتے ہیں۔ اشعار میں قافیہ کی پابندی کی جاتی ہے۔ اس لیے اسے مقفی نظم بھی کہتے ہیں بعض اوقات قافیہ کے ساتھ ردیف کا بھی التزام کیا جاتا ہے۔ ۱۸۵۷ء سے پہلے صرف پابند نظم ہی کا رواج تھا۔ آج بھی معری نظم اور آزاد نظم کے ساتھ پابند نظم ہی زیادہ لکھی جاتی ہیں۔ ڈاکٹر اقبال کی ساری شاعری پابند نظم میں ہے۔ چنانچہ یہاں ڈاکٹر اقبال کی نظم ”لالہ صحرا“ کے اشعار دیے جا رہے ہیں جس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ کس طرح پابند نظم میں ایک ہی وزن اور قافیہ کی پابندی کی جاتی ہے۔

یہ گنبد بینائی یہ عالم تنہائی
مجھ کو تو ڈراتی ہے اس دشت کی پہنائی
بھٹکا ہوا راہی میں بھٹکا ہوا راہی تو
منزل ہے کہاں تیری اے لالہ صحرائی
خالی ہے کلیموں سے یہ کوہ و کمر ورنہ
تو شعلہ سینائی میں شعلہ سینائی
تو شاخ سے کیوں پھوٹا میں شاخ سے کیوں ٹوٹا
اک جذبہ پیدائی اک لذت یکتائی
غواص محبت کا اللہ نگہاں ہو
ہر قطرہ دریا میں دریا کی ہے گہرائی
اس موج کے ماتم میں روتی ہے بھنور کی آنکھ
دریا سے اٹھی لیکن ساحل سے نہ ٹکرائی
ہے گرمی آدم سے ہنگامہ عالم گرم

سورج بھی تماشائی تارے بھی تماشائی
اے باد بیابانی مجھ کو بھی عنایت ہو
خاموشی و دل سوزی سرمستی و رعنائی

☆ معری نظم:

معری نظم ایسی نظم کو کہتے ہیں جس میں وزن بھی ہوتا ہے اور ارکان بحر کی پابندی بھی کی جاتی ہے۔ البتہ اس میں قافیہ اور ردیف سے کام نہیں لیا جاتا۔ چون کہ یہ نظم قافیہ سے عاری ہوتی ہے اس لیے اسے نظم معری یعنی غیر مقفی نظم کہتے ہیں۔ یہاں اسماعیل میرٹھی کی نظم ”چڑیا کے بچے“ کے چند اشعار دیے جا رہے ہیں۔

دو تین چھوٹے بچے، چڑیا کے گھونسلے میں
چپ چاپ لگ رہے ہیں، سینہ سے اپنی ماں کے
چڑیانے مامتا سے، پھیلا کے دونوں بازو
اپنے پروں کے اندر بچوں کو ڈھک لیا ہے
اس طرح روزمرہ کرتی ہے ماں حفاظت
سردی سے اور ہوا سے رکھتی ہے گرم ان کو

مندرجہ بالا اشعار میں ایک شعر کا قافیہ دوسرے سے مختلف ہے۔ اس میں کسی قافیہ کی پابندی نہیں کی جاتی۔

☆ آزاد نظم:

معری ہیئت میں آزاد نظم کو بہت مقبولیت حاصل ہے۔ اس میں قافیہ ردیف کی پابندی نہیں ہوتی، بحر کی بھی پابندی نہیں ہوتی البتہ بحر کے ارکان اور اس کے اوزان یا صوتی

بندشوں کی پابندی ہوتی ہے فرق صرف اتنا ہے کہ معریٰ نظم میں بحر کے مقررہ اوزان استعمال ہوتے ہیں جبکہ آزاد نظم میں ارکان بحر کی تعداد ہر مصرعے میں متعین نہیں ہوتی جس کی وجہ سے مصرعے چھوٹے بڑے ہو جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک آزاد نظم کا یہ اقتباس دیکھیے

موم کی طرح جلتے رہے ہم شہیدوں کے تن
رات بھر جھلملاتی رہی شمع صبح وطن
رات بھر جگمگاتا رہا چاند تاروں کا بن
تشنگی تھی مگر
تشنگی میں بھی سرشار تھے
پیاسی آنکھوں کے خالی کٹورے لیے
منتظر مردوزن

ان مصرعوں میں اول تو یہ کہ کسی قافیے کی پابندی نہیں ملتی اور دوسری خصوصیت یہ ہے کہ تمام مصرعے ایک وزن میں نہیں ہیں۔ بالفاظ دیگر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ نظم آزاد ایسی نظم ہے جس میں نہ قافیے کی پابندی کی جاتی ہے اور نہ ہی بحر کی جس کی وجہ سے کوئی مصرعہ طویل ہو جاتا ہے اور کوئی مختصر۔

(۸) سانیٹ:

سانیٹ مغربی شاعری کی ایک قدیم صنف ہے اور یہ چودہ مصرعوں کی ایک ایسی نظم ہے جس میں ایک بنیادی جذبہ یا خیال کو دو بندوں میں پیش کیا جاتا ہے۔ پہلے بند میں آٹھ اور دوسرے بند میں چھ مصرعے ہوتے ہیں۔ پہلے بند میں خیال کا پھیلاؤ ہوتا ہے اور دوسرے میں اس کی تکمیل کی جاتی ہے۔ کہیں کہیں پہلا بند بارہ مصرعوں پر دوسرا بند دو مصرعوں پر مشتمل ہوتا ہے مگر چودہ مصرعوں کی پابندی ضروری ہے۔ اس میں قافیوں کی ترتیب بدلتی رہتی ہے۔

بہ طور مثال علیم صبا نویدی کا لکھا ایک نعتیہ سانیٹ ے
کون آیا ہے میرے دل میں آج
بھاگ نس نس کا نور آور ہے
ذات کتنی سرور آور ہے
میرے اندر ہے سرخوشی کا راج

آرزو کا سہاگ مہکا ہے
مسکراہٹ کی حکمرانی ہے
اوج پر چاہ کی جوانی ہے
زندگانی کا بھاگ مہکا ہے

مجھ میں اک نور ہے بہاریں ہیں
پھول ، کلیاں ، چمن چمن مجھ میں
رنگ و بو کا ہے بانگن مجھ میں
رحمتوں کے حسیں نظاریں ہیں

میری قسمت ہے کتنی نورانی
مجھ میں اک روشنی ہے قرآنی

(۹) تراخیلے:

فرانسیسی شاعری کی ایک مقبول صنف تراخیلے ہے۔ یہ ایک طرح کا بند ہے۔ ایک ہی بند میں نظم مکمل ہو جاتی ہے۔ یہ آٹھ مصرعوں پر مشتمل نظم ہوتی ہے اس میں صرف دو قافیے

ہوتے ہیں اور اس کی ایک خاص ترتیب ہوتی ہے۔ اس میں پہلا، تیسرا، چوتھا، پانچواں، ساتواں اور دوسرا، چھٹا، آٹھواں مصرعہ ہم قافیہ ہوتے ہیں۔

بہ طور مثال رؤف خیر کا ایک تراخیلے ”ٹائم کپسول“۔

بنو امیہ ہی باقی ، نہ ہیں بنو عباس
نہ اپنے آپ کو دہرا کے تھک سکی تاریخ
ہوا و حرص بھلا کس کو آسکے ہیں اس
بنو امیہ ہی باقی ، نہ ہیں بنو عباس
سروں میں دفن ہوئی اقتدار کی بُو پاس
ہر ایک حرف ہوں پر کھنچا خط نیشخ
بنو امیہ ہی باقی ، نہ ہیں بنو عباس
نہ اپنے آپ کو دہرا کے تھک سکی تاریخ

(۱۰) ہائیکو:

یہ ایک قدیم جاپانی صنف ہے۔ اس صنف کو اردو اور انگریزی سے اپنایا گیا ہے۔ اس میں صرف تین مصرعے ہوتے ہیں مگر شرط یہ ہے کہ ان تینوں مصرعوں کے جملہ ارکان سترہ ہوں۔

بیکل اتساہی کے دو ہائیکو بہ طور مثال۔

بیکل کھڑا دُوار پر
پھونک کے اپنے گھر کو خود ہی
جُرم دھرے سنسار پر

اب اپنے قانون میں
چور ، شاہ سب اک ہیں جیسے
بن مطلب مضمون میں

(۱۱) نثری شاعری:

انگریزی کی ایک صنف prose poetry کی تقلید میں اردو میں اس صنف کو اپنایا گیا۔ اس شاعری میں بحر، ردیف، قافیہ، وزن کی پابندی کی قید نہیں ہوتی۔ اس میں ایک آہنگ ضرور ہوتا ہے اس کی وجہ سے اس میں ایک غنائی کیفیت اور شاعری کا رنگ نظر آتا ہے۔

(B) اصناف نثر

☆ نثر

نثر اس تحریر کو کہتے ہیں جس میں وزن کا اہتمام نہ ہو، (وزن شاعری کا وصف ہے) دوسرے اہام بھی نہ ہو کیوں کہ اگر ایک جملہ میں کئی معنوں ہوں تو یہ نثر کا عیب ہے۔ نثر میں بات صاف طریقہ سے بیان کی جاتی ہے۔ نثر کے لیے ضروری ہے کہ اس میں حقیقت اور واقعیت ہو۔ نثر کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ اس سے وہ کام لیا جائے جو شعر میں آسانی سے ممکن نہ ہو۔ نثر کی کئی اقسام ہیں۔

(۱) سادہ نثر:

اس نثر کو کہتے ہیں جس میں رعایت و مناسبات وغیرہ نہ ہوں بلکہ عام فہم اور آسان الفاظ کا استعمال کیا گیا ہو۔ مثلاً فورٹ ولیم کالج کے رائٹر میرامن کی باغ و بہار کا یہ اقتباس دیکھیے:

”بادشاہ کی عمر چالیس برس ہو گئی۔ ایک دن شیش محل میں نماز ادا کر کر، وظیفہ پڑھ رہے تھے۔ ایک بارگی آئینہ کی طرف جو خیال کرتے ہیں تو ایک سفید بال موچھوں میں نظر آیا کہ مانند تار مقیش کے چمک رہا ہے۔ بادشاہ دیکھ کے آبدیدہ ہوئے اور ٹھنڈی سانس بھری۔ پھر دل میں اپنے سوچ کیا کہ ”فسوس! تو نے اتنی عمر ناحق برباد کی اور اس دنیا کی حرص میں ایک عالم کو زیر

وزبر کیا۔ اتنا ملک جو لیا، اب تیرے کس کام آوے گا؟“ آخر یہ سارا مال اسباب کوئی دوسرا اڑاوے گا تجھے تو پیغام موت کا آچکا، اگر کوئی دن جیسے بھی تو بدن کی طاقت کم ہوگی۔“ (باغ و بہار، شروع قصہ سے، ص ۷۷)

(۲) سلیس نثر:

لفظ اور معنی دونوں اعتبار سے آسان نثر کو سلیس نثر کہتے ہیں اس میں رعایت لفظی کا استعمال بھی نہیں ہوتا۔ خطوط غالب اس کی بہترین مثال ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

”پیر و مرشد! آپ کو میرے حال کی بھی کچھ خبر ہے۔ ضعف نہایت کو پہنچ گیا، مینائی میں فتور پڑا، حواس مختل ہوئے، جہاں تک ہو سکے احباب کی خدمت بجالایا، اور اوراق اشعار لیٹے لیٹے دیکھتا تھا اور اصلاح دیتا تھا۔ اب نہ آنکھ سے اچھی طرح سوچھے نہ ہاتھ سے اچھی طرح لکھا جائے۔“

(۳) مقفی نثر:

ایسی نثر جس میں وزن تو نہ ہو لیکن قافیہ کا اہتمام کیا گیا ہو۔ کسی زمانے میں اس کا رواج تھا۔ بلکہ ایسا جنون تھا کہ میرامن کی سادہ نثر کے مقابلے میں رجب علی بیگ سرور نے ”فسانہ عجائب“ نامی مکمل کتاب لکھ دی جو مقفی نثر کی بہترین مثال ہے، مثلاً:

”طیب ہر ایک مسیحائی کرتا ہے، ”قم بأذنی“ کا دم بھرتا ہے۔ جسے دیکھا بقراط، سقراط، جالینوس زماں ہے۔ اس معنی میں یہ خطر رشک زمین یونان ہے۔ میرک جان صاحب پیرنے کے فن سے ایسے آشنا ہوئے کہ مردم بڑو بجر سرگرم ثنا ہوئے۔ شاعر زبان داں ایسے کہ عُرقی و خاقانی کی غلطی بتائی، فردوسی و انورسی کی یاد بھلائی۔ شیخ امام بخش ناسخ نے یہ ہندی کی چندی کی اور روزمرہ کو ایسا فصیح و بلیغ کیا کہ کلام ساتقیں منسوخ ہوا۔ فصحاء شیراز و اصفہاں اس سیف زباں کا جو ہر دیکھ کے لوہا مان گئے۔ اپنے فتح پر منفعل ہوئے، اس زبان کا حسن جان گئے۔ زمین شعر کو آسمان پر پہنچایا، سیکڑوں کو استاد بنایا۔ خواجہ حیدر علی کی آتش بیانی، شررا فشانہ سے دل جلوں کے سینے میں

سوز و گداز ہے۔ مرد قانع شاعر ممتاز ہے۔“ (ص ۱۳)

(۴) مستحج نثر:

مستحج ایسی نثر کو کہتے ہیں جس کے دو جملوں کے تمام الفاظ ایک دوسرے کے ہم وزن ہوں اور آخر کے الفاظ بھی ہم قافیہ ہوں اور کبھی ردیف کا بھی استعمال ہو۔ مثال:

”پونڈا پھیکا اتنا برا کہ جس کی برائی بیان سے باہر ہے، پونڈا میٹھا ایسا بھلا کہ اس کی بھلائی گمان سے بڑھ کر ہے۔“ (دریائے لطافت، سید انشا)

اس مثال میں دو جملے ہیں۔ پہلے جملے میں ”پونڈا پھیکا اتنا برا“ اور دوسرے میں ”پونڈا میٹھا ایسا بھلا“ ہم وزن جب کہ ”جس کی برائی بیان سے باہر“ اور ”اس کی بھلائی گمان سے بڑھ کر“ ہم وزن ہیں۔ برائی، بھلائی، بیان، گمان، باہر، بڑھ کر ہم قافیہ الفاظ ہیں۔

(۵) رنگین نثر:

ایسی نثر کو کہتے ہیں جس میں صنائع لفظی و معنوی سے کام لیا گیا ہو۔ مثلاً:

”بندہ حرارت قلب کے عارضے سے حیران و ششدر رہتا ہی تھا، اب ضعف دماغ کی بیماری نے اور بھی عاجز اور زچ کر دیا ہے۔ ہر دم یہی سوچ اور منصوبہ آتا تھا کہ کدھر جاؤں اور کون ایسی چال چلوں کہ یہ عارضہ بڑھنے نہ پائے۔ بارے ان دنوں حکیم شاہ رخ مرزا صاحب اس شہر میں وارد ہوئے، ان کی تعریف بہت سنی تھی کہ ان کے نزدیک بادشاہ اور وزیر اور فقیر مسکین اور امیر فیل برابر ہیں۔ مریضوں کی خبر گیری کے واسطے بارہ درمی میں شطرنجی بچھائے بیٹھے رہتے ہیں۔“

اس نمونے میں بہت سارے الفاظ شطرنج کے مناسبات سے تعلق رکھتے ہیں۔ مثلاً قلب، زچ، منصوبہ، کدھر جاؤں، چال چلوں، بڑھنے نہ پائے، بادشاہ، وزیر امیر فیل نشین وغیرہ۔ یہ صنائع بدائع کا استعمال ہی اسے خوبصورت اور رنگین بناتا ہے۔

ذیل میں اصناف نثر کی تفصیلات ملاحظہ فرمائیں۔

(الف) افسانوی نثر

(۱) داستان:

داستان اردو افسانوی ادب کی قدیم ترین صنف ہے۔ واقعات کو قوت بخیلہ کے سہارے بیان کرنے ہی کو فسانہ گوئی کہتے ہیں۔ اگرچہ فسانہ کے لغوی معنی جھوٹی اور فرضی کہانی کے ہیں۔ داستان بنیادی طور پر سننے سنانے یعنی بیان کا فن ہے۔ اس کے موضوعات میں عشق اہم ترین موضوع ہے۔ داستانیں تحریری شکل میں آنے سے قبل سنائی جاتی تھیں۔ داستان گوئی کی گذشتہ صدیوں میں محفلیں آراستہ ہوتی تھیں۔ داستان گو داستان بیان کرتا تھا۔ داستان اس ماحول کی پیداوار ہے جہاں لوگوں کے پاس فرصت اور اطمینان کی افراط تھی، غم روزگار سے بے نیاز تھے، فکر آخرت سے آزاد تھے۔ اس لیے اپنی تفریح کا سامان داستانوں سے فراہم کرتے تھے۔ داستان گو واقعات کو اپنے تخیلات سے اس حد تک دل چسپ بنا دیتے تھے کہ سامعین حیرت و استعجاب کے فضا میں غرق ہو جاتے تھے۔ داستان اور داستان گو کی کامیابی اسی میں تھی کہ وہ سامعین کی دل چسپی اور توجہ کو قائم رکھے، وہ داستان میں ایسے ناقابل یقین واقعات کو شامل کرتا تھا جو سامعین کے عالم خیال میں بھی نہ آئے ہوں۔ قصہ میں حسن و عشق کی خوش نمایوں، خیر و شر کی لڑائیوں اور مافوق الفطرت عناصر کو شامل کر کے حیرت و استعجاب کی فضا پیدا کر کے پیش کرنے کا نام داستان ہے۔

☆ عناصر ترکیبی: (۱) طوالت (۲) پلاٹ (۳) کردار نگاری (۴) مافوق الفطرت عناصر (۵) منظر نگاری (۶) اسلوب۔

(۲) ناول:

ایک خاص طوالت کا نثری قصہ ناول ہے۔ ہنری جیمس نے ناول کی تعریف یوں کی ہے: ”ناول اپنی وسیع ترین تعریف میں زندگی کا شخصی اور راست اثر ہے۔“

کلاریوز کے کہنے کے مطابق: ”روزمرہ آنکھوں کے سامنے ہونے والے واقعات کو مانوس اور مربوط انداز میں پیش کرنے کا نام ناول ہے۔“

ورجینا وولف نے ناول کی اہم خصوصیات کا احاطہ یوں کیا ہے: ”ناول انسانوں کے متعلق لکھے گئے ہیں۔ اس لیے وہ ہمارے اندر ایسے ہی احساسات ابھارتے ہیں جیسا کہ حقیقی دنیا میں ابھارتے ہیں۔ ناول فن کی وہ واحد ہیئت ہے جس کی واقعیت ہم کو یقین کرنے پر مجبور کرتی ہے یعنی وہ حقیقی انسان کی زندگی کا بھرپور اور صداقت شعارانہ ریکارڈ پیش کرتا ہے۔“

ڈیوڈ سیسل ناول کو ایسا فنی کارنامہ قرار دیتا ہے جو ہم کو ایک ”زندہ دنیا“ سے متعارف کرتا ہے۔ لیکن یہ دنیا ہماری اپنی دنیا سے ”مشابہ“ بھی اور اپنی ایک ”الگ انفرادیت“ بھی رکھتی ہو۔

☆ جزائے ترکیبی: (۱) کہانی (۲) پلاٹ (۳) کردار (۴) مکالمے (۵) پس منظر یا زماں و مکاں (۶) اسلوب (۷) نقطہ نگاہ۔

(۳) افسانہ:

افسانہ انیسویں صدی کے آخر کی پیداوار ہے۔ افسانہ قصہ کی وہ شکل ہے جس کے لیے انگریزی میں ”شارٹ اسٹوری“ کا نام استعمال ہوتا ہے۔ اب اس کے لیے ”فکشن“ کا لفظ مستعمل ہے۔ یہ داستان اور ناول کی ارتقائی اور ترقی یافتہ صورت ہے۔ بے شمار تعریفوں کے سبب افسانے کی کوئی ایک مخصوص تعریف بے حد مشکل ہے۔ عام طور پر فرضی کہانی کو افسانہ کہا جاتا ہے جو حقیقت کے قریب ہو اور زندگی کی عکاس ہو۔ کیوں کہ اسے زندگی کا ایک ادبی نقش قرار دیا جاتا ہے۔ فنی لحاظ سے ایک افسانے کے لیے ضروری ہے کہ وہ وحدت تاثر کا حامل ہو۔ وحدت تاثر قائم کرنے کے لیے افسانے میں صرف ایک مقصد پر زور دیا جاتا ہے۔ اگر مقاصد ایک سے زیادہ ہوں تو افسانے

میں بہت سی فنی خرابیاں پیدا ہوجاتی ہیں۔ اختصار افسانہ کی خوبی ہے۔ اڈگرالین پو (Adgaralinpoe) کا قول ہے کہ افسانہ وہ مختصر کہانی ہے جو آدھ گھنٹہ سے لے کر ایک گھنٹہ یا دو گھنٹہ کے اندر پڑھی جاسکے۔ بعض نے کہا کہ ایک نشست میں پڑھا جاسکے غرضیکہ افسانہ مختصر مگر معنوی اعتبار سے جامعیت کا شاہکار ہونا چاہیے۔

اردو افسانے کا آغاز نثری پریم چند اور سجاد حیدر یلدرم سے ہوا مگر بعض نقاد سر سید احمد خان کو اردو کا پہلا افسانہ نگار اور ان کی تحریر ”گزر اہوا زمانہ“ کو پہلا افسانہ قرار دیتے ہیں جو ۱۸۷۰ء میں سر سید احمد خان نے لکھا تھا۔

☆ اجزائے ترکیبی: (۱) پلاٹ (۲) کردار نگاری (۳) زمان و مکان (۴) وحدت تاثر (۵) موضوع (۶) اسلوب۔

☆ اسلوب کی اقسام: (۱) بیانیہ (۲) سوانحی (۳) مراسلاتی (۴) مخلوط (۵) یادداشتی۔

(۴) ڈرامہ:

انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا کی رو سے لفظ ڈراما اس یونانی لفظ سے لیا گیا ہے جس کے معنی ہیں ”کر کے دکھائی ہوئی چیز“۔ بوطیقا میں ارسطو نے ڈرامے کی کوئی باقاعدہ تعریف پیش نہیں کی مگر اس سلسلے میں پیش کی گئی اس کی توضیحات سے ڈرامے کی تعریف اس طرح مرتب کی جاسکتی ہے۔ ”ڈراما انسانی افعال کی ایسی نقل ہے جس میں الفاظ کی موزونیت اور نغمے کے ذریعے کرداروں کو محو گفتگو اور مصروف عمل ہو ہو ویسا ہی دکھایا جائے جیسے کہ وہ ہوتے ہیں یا ان سے بہتر یا بدتر انداز میں پیش کیا جائے۔“ (ترجمہ عزیز احمد، ایم اے اردو سال دوم، ساتواں پرچہ، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، ص ۱۰۸)

یوں تو مختلف ادیبوں اور دانشوروں نے ڈرامے کی متعدد تعریفیں پیش کی ہیں۔ جس کا نچوڑ یہ ہے۔ ”کسی قصے یا واقعے کو کرداروں کے ذریعے تماشائیوں کے روبرو پھر سے عملاً پیش کرنے کو ڈراما کہتے ہیں۔“

محققین کی ایک بڑی تعداد نواب واجد علی شاہ کو اردو کا پہلا ڈرامہ نگار اور ان کے ڈرامہ

”رادھا کنہیا“ کو اردو کا پہلا ڈرامہ مانتے ہیں۔ جب کہ بعض نقاد ”علی بابا چالیس چور“ (۱۸۵۲ء) کو پہلا ڈرامہ اور کیپٹن گرین ادے کو پہلا ڈرامہ نگار مانتے ہیں۔ حبیب تنویر، مرزا محمد ہادی رسوا، عبدالحلیم شرر، امتیاز علی تاج، خواجہ احمد عباس، عصمت چغتائی، منو، آغا حشر کاشمیری، پروفیسر محمد مجیب، راجندر سنگھ بیدی اور حیات اللہ انصاری مشہور ڈرامہ نگار ہیں۔

☆ اجزائے ترکیبی: (۱) پلاٹ (۲) کردار (۳) مکالمہ (۴) زبان (۵) موسیقی (۶) آرائش۔

☆ اقسام: (۱) ٹریجڈی (۲) کامیڈی (طربیہ) (۳) ٹریجیڈی کامیڈی (الم طربیہ) (۴) میلوڈرامہ (۵) فارس (۶) ڈریم (۷) اوپیرا۔

(ب) غیر افسانوی نثر

(۱) مضمون:

کسی بھی عنوان پر معلومات یکجا کر کے اس کے ذیلی موضوعات پر روشنی ڈالتے ہوئے دل چسپ اور جامع مواد کو ترتیب، تسلسل اور روانی کے ساتھ پیش کرنا یا کسی موضوع پر ترتیب کے ساتھ اظہار خیال کرنا ”مضمون“ کہلاتا ہے۔ مضمون کو تین اجزا میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

(۱) تمہید جس میں موضوع کا تعارف کروایا جاتا ہے۔

(۲) نفس مضمون جس میں موضوع کی تفصیلات بیان کی جاتی ہیں۔

(۳) خاتمہ۔

مضمون میں ادب، سائنس، مذہب، ٹکنالوجی، امراض، علاج، سیاست، سماج، معاشرت غرض کہ ہر موضوع پر خیالات کا اظہار ہو سکتا ہے۔ مختلف موضوعات پر معلومات فراہم کر کے اکثر اسے ایک ہی نشست میں مطالعہ کے قابل بنایا جاسکتا ہے۔ اردو میں مضمون نگاری کی روایت انگریزی ادب کی دین ہے۔ چنانچہ 1824ء میں جب دلی کالج قائم کر کے انگریزوں نے علوم و فنون کی ترقی پر توجہ دی تو اس کالج سے وابستہ ماسٹر رام

چندر نے سب سے پہلے ”مضمون نگاری“ کی بنیاد رکھی جن کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ماسٹر پیارے لال اور پھر سٹمس العلماء ذکاء اللہ نے ”مضمون نگاری“ کی روایت کو فروغ دیا۔ سر سید احمد خان اور ان کے رفقاء نے مضمون نگاری کو فروغ دیا۔ موضوعات کے لحاظ سے مضامین کی کئی قسمیں ہیں جیسے علمی مضامین، ادبی مضامین، تاریخی مضامین، سیاسی مضامین، معاشی مضامین، معاشرتی مضامین، سائنسی مضامین، تنقیدی مضامین اور تحقیقی مضامین وغیرہ۔

(۲) انشائیہ:

مضمون کا ایک ایسا ہلکا پھلکا انداز جس میں بے ساختہ بے تکلفانہ کسی موضوع پر اظہار خیال کیا جائے تو اسے انشائیہ قرار دیا جاتا ہے۔ انشائیہ کے لیے انگریزی میں Essay کا لفظ رائج ہے۔ انشائیہ میں مضمون کی خصوصیات نہیں ہوتیں بلکہ انشائیہ نگار اپنے ذاتی تجربات اور مشاہدات کو ہلکے پھلکے اور شگفتہ انداز میں اپنی تحریر کا موضوع بناتا ہے جس کی وجہ سے مضمون اور انشائیہ میں موجود فرق کو محسوس کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ دکن میں لکھی گئی ملا وجہی کی نثری کتاب ”سب رس“ کے بارے میں محققین کا خیال ہے کہ انشائیہ کے ابتدائی نقوش اس میں موجود ہیں۔ محمد حسین آزاد کو بعض محققین پہلا انشائیہ نگار تسلیم کرتے ہیں جن کے انشائیوں کا مجموعہ ”نیرنگ خیال“ کے نام سے شائع ہو چکا ہے لیکن بعض کا خیال ہے کہ انگلستان کے سفر کے بعد سر سید احمد خان کی تحریروں سے اس صنف کا باقاعدہ آغاز ہوا جس کا مطالعہ انہوں نے لندن کے اخبارات اور انگریزی رسالوں میں کیا تھا۔ رسالہ ”تہذیب الاخلاق“ میں سر سید کے ایسے بے شمار مضامین ہیں جن میں بے تکلفی، بے ساختہ پن اور فکر کی گہرائی موجود ہیں۔ ”مضامین سر سید“ کے نام سے سر سید کے انشائیے شائع ہو چکے ہیں۔ سر سید کے بعد نذیر ناصر، فراق دہلوی، خواجہ حسن نظامی اور دوسرے قلم کاروں نے انشائیہ کی صنف میں مزید اضافے کیے۔

(۳) خطوط یا مکتوب:

مکتوب نگاری دو انسانوں کے مابین تعلقات کی ترجمانی کرنے والی ایک ایسی صنف نثر ہے جس میں غیر افسانوی انداز میں خیالات کی ترسیل ہوتی ہے اور حقیقت حال کا بیان ہوتا ہے۔ ماضی میں جو لوگ فاصلوں پر رہتے تھے، تبادلہ خیالات اور خیر خیریت جاننے کے لیے بے چین رہتے تھے، ان لوگوں کے آپسی تبادلہ خیال کا ایک ہی ذریعہ ”خط“ تھا۔ مختلف النوع جذبات، احساسات، خیالات اور اطلاعات تحریر کر کے اس کی ترسیل کا انتظام کرنا مکتوب نگاری کی خصوصیات ہیں۔ اردو کے بیشتر مصنفین اور ادیبوں کے خطوط ادب کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ اردو میں مکتوب نگاری کا آغاز مرزا غالب کے خطوط سے ہوا۔ مرزا غالب نے اردو کے ابتدائی خطوط 1846ء میں تحریر کیے۔ اس سے قبل فارسی میں مکتوب نگاری کا چلن عام تھا۔ مرزا غالب کے بعد اس صنف نے کافی ترقی کی۔ چنانچہ مولانا حالی، سر سید احمد خان، محمد حسین آزاد، ڈپٹی نذیر احمد اور مولانا ابوالکلام آزاد جیسے نامور ادیبوں کے خطوط شائع ہو چکے ہیں جو اس بات کا ثبوت ہے کہ اردو میں مکاتیب نگاری کی صنف قدیم اور توانا ہے۔ دورِ حاضر میں ترسیل کے نئے ذرائع پیدا ہو چکے ہیں اس لیے خطوط نگاری میں کمی واقع ہوئی ہے مگر اس کی اہمیت اب بھی مسلم ہے۔

* خط کے اجزا:

(۱) مکتوب نویس کا نام اور پتہ (۲) تاریخ تحریر (۳) نشان مجاریہ (۴) مقدمہ یا سبجیکٹ (۵) حوالہ نشان (۶) القاب (۷) آداب (۸) نفس مضمون (۹) خاتمہ (۱۰) مکتوب نویس کے دستخط (۱۱) مکتوب الیہ کا نام اور پتہ۔

* خطوط کی قسمیں:

(۱) نجی اور ذاتی خطوط (۲) دفتری / حکومتی خطوط (۳) کاروباری / تجارتی خطوط (۴) اخباری خطوط / مراسلے (۵) ادیبوں اور دانشوروں کے خطوط۔

(۴) سوانح:

کسی بھی نامور شخص کی زندگی کے حالات تفصیل کے ساتھ ایک کتاب میں پیش کرنے کا فن سوانح کہلاتا ہے۔ سوانح میں کسی مشہور شخص کی زندگی کے محاسن اور معائب دونوں بیان کیے جاتے ہیں۔ سوانح میں مستند اور جامع مواد کی پیش کشی ضروری ہوتی ہے بلکہ اس کے ساتھ ہی اس حقیقت پر بھی نظر رکھنی پڑتی ہے کہ جس شخص پر سوانح لکھی جا رہی ہے اس کی زندگی کے تمام کارناموں کو کتاب میں سلسلہ وار بیان کر دیا جائے۔ اگر کتاب میں صرف محاسن و کمالات بیان کیے جائیں تو ایسی سوانح ادبی معیارات کی تکمیل نہ کر سکے گی۔ سوانح میں نہ تو شخصیت کے بارے میں فرضی واقعات بیان کیے جاسکتے ہیں اور نہ ہی مبالغہ آمیز اسلوب۔ مولانا الطاف حسین حالی کو اردو کا اولین اور سب سے بہترین سوانح نگار کا درجہ حاصل ہے۔ انہوں نے سب سے پہلے شیخ سعدی علیہ الرحمہ کی حیات پر ”حیات سعدی“ اس کے بعد مرزا غالب پر ”یادگار غالب“ اور آخر میں سر سید احمد خاں پر ”حیات جاوید“ لکھ کر اردو ادب میں سوانح کی بنیاد رکھی۔

(۵) خودنوشت سوانح:

خودنوشت سوانح ایک غیر افسانوی صنف ہے جس میں کوئی شخص اپنے حافظہ کے بل بوتے پر اور کسی طرح کا کوئی موجود ہو تو اس سے استفادہ کر کے شخصی تاثرات کے ساتھ اپنی سوانح حیات ترتیب دیتا ہے۔ اگر کوئی انسان اپنی زندگی کے حالات بقلم خود تحریر کرے اور حقائق کی روشنی میں حالات پیش کرے تو ایسی تحریر خودنوشت سوانح قرار دی جاتی ہے۔ خودنوشت سوانح ایک ایسا فن ہے جس میں انسان اپنے قلم سے اپنی زندگی کے حالات کو اجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ اپنا نقطہ نظر اور اپنی پسند اور ناپسند کا اظہار کر سکتا ہے۔ خودنوشت سوانح ساری زندگی کے حالات پر محیط کتابی شکل میں پیش ہو سکتی ہے یا چند قابل ذکر واقعات کے ساتھ ایک مضمون کی شکل میں۔

خودنوشت سوانح اور آپ بیتی میں بنیادی فرق یہ ہے کہ آپ بیتی کسی مخصوص واقعہ یا حالات کی نمائندہ ہوتی ہے اور خودنوشت میں پیدائش سے لے کر سوانح قلمبند کرنے کے دور تک کے تفصیلی حالات کا ذکر ہوتا ہے۔ ہندوستان کی آزادی میں حصہ لینے والے بیشتر سیاسی رہنماؤں نے اپنی خودنوشت سوانح حیات تحریر کی اور آزادی کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ گاندھی جی نے اپنی خودنوشت سوانح ”My Life and Experiments with Truth“ انگریزی میں لکھی جس کا اردو ترجمہ ”تلاش حق“ کے زیر عنوان کیا گیا۔

(۶) دیباچہ:

کتابوں کے ابتدائی صفحات میں مصنف کی شخصیت یا فن کے تعارف کے طور پر جو تحریریں شامل کی جاتی ہیں اسے دیباچہ کہتے ہیں۔ عموماً دیباچہ کسی مشہور قلم کار یا دانش ور سے لکھوایا جاتا ہے۔ لیکن کبھی خود مصنف اپنے یا اپنی کتاب کے بارے میں خیالات کا اظہار کرتا ہے، اس تحریر کو دیباچہ، تقریظ یا پیش لفظ کا عنوان دیا جاتا ہے۔ تصنیف و تالیف کے ابتدائی دور میں تقریظ نگاری کا طریقہ عام تھا جس میں کتاب لکھنے والے کی مدح سرائی کی جاتی تھی۔ اس کے بعد پیش لفظ اور دیباچہ نویسی کا چلن عام ہوا جس کے ذریعے نہ صرف کتاب اور مصنف کو متعارف کیا جاتا ہے بلکہ کتاب کے نمایاں خدوخال کی بھی نشاندہی کی جاتی ہے۔ اب پیش لفظ یا دیباچے کو نئے نئے عنوانات کے تحت لکھا جا رہا ہے۔ اختصار کے ساتھ حقیقت پسندانہ خیالات پیش کرنے کے علاوہ نکتہ آفرینی اور مصنف کی بعض قابل ذکر و دل چسپ خصوصیات کے تذکرے کی وجہ سے دیباچہ نویسی کو کافی فروغ حاصل ہوا ہے۔

گویا کہ دیباچہ نویسی ایک ایسا فن ہے جس میں تنقید و تحقیق کی بجائے کتاب کے متن سے قبل ایک تاثراتی مضمون شامل کیا جاتا ہے۔ تنقیدی یا تحقیقی نوعیت کے دیباچے بھی لکھے جاتے ہیں۔ روایت ہے کہ دیباچے میں تنقیدی و تحقیقی انداز اختیار کیا جائے تو اکثر اسے مقدمہ کا نام دیا جاتا ہے۔ جو دیباچے خالص تنقیدی نوعیت کے ہیں ان کا ذکر تنقید کی صنف

میں ہوگا، جیسے خواجہ الطاف حسین حالی کی مشہور زمانہ مسدسِ حالی کا دیباچہ۔ جس کے بعد مقدمہ کے زیرِ عنوان تنقیدی دیباچے لکھے گئے اور یہ سلسلہ ہنوز دراز ہے۔ تاہم تاثراتی اور تعارفی دیباچے بھی مقدمہ کے عنوان سے شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اردو میں دیباچہ تحریر کرنے کی روایت کا آغاز مرزا محمد رفیع سودا نے کیا۔ ان کے کلیات کا دیباچہ اردو میں لکھا گیا تھا۔ جنوبی ہند کے بعض محققین کے بموجب مرزا محمد رفیع سودا سے قبل مدراس کے ایک اہم ادیب محمد باقر آغا ویلوری نے سب سے پہلے اردو میں دیباچہ نویسی کی بنیاد رکھی۔

(۷) سفرنامہ:

اردو میں داستانی سفرناموں کی روایت عام تھی۔ ہندوستان میں انگریزوں کی آمد کے بعد سفرناموں میں حقائق پر مبنی واقعات، تجربات، مشاہدات اور چشم دید مناظر کا ذکر کیا جانے لگا۔ بادشاہوں کے خاص مقربین نے روزناموں اور ڈائریوں کی شکل میں سفرنامے لکھے۔ روایتی قصے کہانیوں سے گریز کرتے ہوئے حقائق کی پیش کشی کی وجہ سے ”سفر نامہ“ کو غیر افسانوی صنف ادب میں خاص اہمیت حاصل ہوئی۔ تجارت، حصولِ علم، تبلیغِ دین، جہاں بانی، سیاسی مقاصد، تلاشِ معاش، مقاماتِ مقدسہ کی زیارت اور اس نوعیت کے کتنے ہی مقاصد ہیں جن کے لیے انسان سفر کرتا رہا اور سفرنامے تحریر کرتا رہا ہے۔

اردو میں سفرنامے کی روایت کا آغاز 1847ء میں ہوا جب کہ محمد یوسف خاں کابل پوش نے ”عجائب فرنگ“ لکھی۔ اس کتاب میں سفرِ انگلستان کے دل چسپ حالات بیان کیے گئے ہیں۔ اس کے بعد سر سید احمد خان نے ”مسافرانِ لندن“ اور شبلی نعمانی نے ”سفرنامہ مصوروم و شام“ تحریر کیا جنہیں اردو کے ابتدائی سفرناموں کا موقف حاصل ہے۔ سفرناموں میں داستان کی داستان طرازی، ناول کی فسانہ طرازی، افسانے کی چونکا دینے والی کیفیتیں اور ڈراما کی منظر کشی ملتی ہے یعنی فکشن کی تمام اصناف کے اوصاف سفرناموں میں ملتے ہیں۔ کرنل محمد خاں کی خودنوشت سوانح ”بجنگ آمد“ سفرنامے کے انداز

پر لکھی گئی۔ جدید ترین سفرناموں کا رجحان شگفتہ بیانی سے عبارت ہے۔ آج کے سفرنامے گائیڈ بک نہیں بلکہ ادب اور سیاحت کا حسین ترین اظہار بن گئے ہیں۔ ابن انشا، ممتاز مفتی، مستنصر حسین تاڑ، مجتبیٰ حسین اور یوسف ناظم کے سفرنامے مشہور ہیں۔

(۸) آپ بیتی:

خود پر مبنی ہوئے حالات کے ذکر کو آپ بیتی کہتے ہیں۔ بن باس کی زندگی، قید کے حالات، نظر بندی کے دور کے حالات اور واقعات کا ذکر بھی آپ بیتی کے ذریعے ممکن ہے۔ فنی اعتبار سے آپ بیتی ایک ایسی تحریر ہے جس میں خود پر گزرے ہوئے اچھے اور برے حالات کے علاوہ صدمات اور تاثرات کا اظہار بھی کیا جاتا ہے۔ آپ بیتی لکھنے والے اپنے حالات اور دل چسپ واقعات کے تانے بانے میں تاثرات کو گوندھ کر خودنوشت کا مواد تیار کرتے ہیں۔ گویا کہ آپ بیتی میں نہ قصہ کہانی کا ذکر ہوتا ہے اور نہ ہی فرضی واقعات کا بیان ممکن ہے۔ اردو نثر میں آپ بیتی ایک ایسی صنف ہے جو ہر دور میں رائج رہی اور آج بھی اس کا سلسلہ دراز ہے۔ 1857ء کے غدر کے دوران ہندوستان کے باشندوں پر جو مصائب گذرے انہیں ”آپ بیتی“ کی صورت میں بیان کیا گیا۔ علامہ فضل حق خیر آبادی علیہ الرحمہ نے جزیرہ انڈمان (کالا پانی) میں رہتے ہوئے ”الثورة الہندیہ“ (باغی ہندوستان) تحریر کی جو انقلابِ آزادی کا ایک مستند ترین ماخذ ہے۔ ”الثورة الہندیہ“ اور ”قصائد فتنۃ الہند“ (منظوم) کو علامہ خیر آبادی نے قید تہائی سے 1860ء میں بذریعہ حضرت مفتی عنایت احمد کاکوروی اپنے فرزند مولانا عبدالحق خیر آبادی کے پاس کوئٹہ اور پٹنل سے کپڑا وغیرہ لکھ کر بحفاظت تمام بھیجا تھا۔ اس کتاب پر مولانا ابوالکلام آزاد نے تعارف لکھا اور مولانا محمد عبدالشاہد خاں شیروانی نے 1946ء کو ترجمہ کر کے شائع کیا۔ محمد جعفر تھانیسری کی کتاب ”کالا پانی“ کوارڈو کی اولین آپ بیتی کی حیثیت سے شہرت حاصل ہے۔

(۹) خاکہ:

انگریزی ادب میں خاکہ کے لیے Sketch کا لفظ مروج ہے۔ خاکہ کے معنی کچا نقشہ، ڈھانچہ یا لکیروں کی مدد سے بنائی ہوئی تصویر کے ہیں اور خاکہ کے لیے اردو میں مرقع، شخصی مرقع، چہرہ بشرہ، قلمی تصویر اور حیاتی جاگتی تصویر جیسی اصطلاحیں استعمال کی گئی ہیں۔ ادبی اصطلاح میں خاکہ سے مراد وہ تحریر ہے جس میں نہایت مختصر طور پر اشارے کنائے میں کسی شخصیت کا ناک نقشہ، عادات و اطوار اور کردار کو سیدھے سادے انداز میں مبالغے کے بغیر اس طرح پیش کرنا کہ اس کی چلتی پھرتی تصویر سامنے آجائے اور اس کے افکار و خیالات بھی ابھر کر سامنے آجائیں۔ خاکہ درحقیقت ایک مضمون کی حیثیت رکھتا ہے۔ خاکہ میں کسی ایک شخصیت کی زندگی کے اہم نکات کی دل چسپ انداز میں نشاندہی کی جاتی ہے۔ خاکہ نگاری میں طویل سوانح سے زیادہ دل چسپ مواد پیش ہوتا ہے اور ویسے بھی اختصار نویسی کے اس دور میں خاکے کو سوانح پر ترجیح دی گئی ہے۔ خاکہ نگار شخصیت کی مرقع کاری کا کام انجام دیتا ہے۔ خاکہ میں شخصیت کے منفی اور مثبت دونوں رویوں کی نشاندہی کی جاتی ہے۔ کہا گیا کہ خاکہ نگاری ایسا فن ہے جس میں نگینہ چننے کا کام انجام دیا جاتا ہے۔ اردو میں خاکہ نگاری کے ہلکے نقوش سب سے پہلے تذکروں میں مل جاتے ہیں۔ محمد حسین آزاد کی مشہور کتاب ”آب حیات“ میں خاکہ کے ابتدائی نقوش پائے جاتے ہیں۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کی ”ڈپٹی نذیر احمد کی کہانی: کچھ ان کی کچھ میری زبانی“ کو اردو کی پہلی طویل خاکہ نگاری کی کتاب قرار دیا گیا ہے۔ مولوی عبدالحق کی تصنیف ”چند ہم عصر“ اردو میں خاکہ نگاری کے اولین نمونوں میں سے ہے۔ رشید احمد صدیقی نے ”گنج ہائے گراں مایہ“، شاہد احمد دہلوی نے ”دلی کی اہم شخصیتیں“، اشرف صبوحی نے ”دلی کی عجیب و غریب شخصیتیں“ لکھ کر خاکہ نگاری کو فروغ دیا۔

(۱۰) رپورتاژ:

کسی جلسہ، محفل، کانفرنس، سمپوزیم، مشاعرہ یا اس نوعیت کی دیگر تقاریب کی مکمل کارروائی قلم بند کی جائے تو اسے رواد کہتے ہیں۔ لیکن کوئی ادیب اسی تفصیل کو ادبی چاشنی کے ساتھ چشم دید واقعات کے طور پر شخصی تاثرات شامل کر کے، پوری دل چسپیاں پیدا کرتے ہوئے بیان کرے تو اسے رپورتاژ کہتے ہیں۔ بنیادی طور پر رپورتاژ ادبی اور فنی خصوصیات سے مالا مال مضمون ہوتا ہے۔ رپورتاژ نگار علمی و ادبی جولانی کے ساتھ ادب کے اہم نکات کو شامل کر کے ایسی دل چسپ رپورتاژ تیار کرتا ہے جس میں باریک بینی اور بذلہ سنجی کو بھی دخل ہوتا ہے۔ اردو میں سب سے پہلے کرشن چندر نے ”پودے“ لکھ کر رپورتاژ نگاری کی بنیاد رکھی۔ کرشن چندر کے بعد اردو کے بیشتر ترقی پسند تحریک کے قلم کاروں نے اس صنف میں طبع آزمائی کی اور دورِ حاضر میں بھی اس صنف کی اہمیت میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

(۱۱) طنز و مزاح:

آکسفورڈ انگلش ڈکشنری کے الفاظ میں: طنز، شعری یا نثری وہ تخلیق ہے جس میں روزمرہ کی کمزوریوں یا بے وقوفیوں کو کبھی کبھی کچھ حقیقتوں کے ساتھ مذاق اڑایا جاتا ہے۔ اس کا مقصد کسی فرد خاص یا افراد کے گروہوں کا مضحکہ اڑانا ہوتا ہے۔

طنز کی مختلف تعریفیں کی گئی ہیں۔ وزیر آغا کہتے ہیں ”طنز بنیادی طور پر ایک ایسے باشعور، حساس اور دردمند انسان کے ذہنی رد عمل کا نتیجہ ہے جس کے ماحول کو ناہمواریوں اور بے اعتدالیوں نے تختہ مشق بنا لیا ہو۔ طنز میں نشتریت کا پہلو ضرور غالب رہتا ہے۔“ (اردو ادب میں طنز و مزاح)

طنز نگار ایک سماجی مصلح ہوتا ہے۔ سماج میں موجود نقائص اور عیوب کو طنز نگار بڑی فن کاری کے ساتھ اجاگر کرتا ہے۔ گویا کہ طنز نگار ایک سرجن ہوتا ہے جو اپنے نشتر سے سماج میں موجود فاسد مادوں کا خارج کرتا رہتا ہے۔ معیاری طنز و نظر افنت کی بنیاد غالب نے اپنے خطوط کے ذریعہ

رکھی۔ مہدی افادی، محفوظ علی بدایونی، خواجہ حسن نظامی، سلطان حیدر جوش، سجاد حیدر یلدرم، ششی پریم چند، سجاد علی انصاری، مرزا فرحت اللہ بیگ، قاضی عبدالغفار، ملا رموزی، رشید احمد صدیقی، سید احمد پطرس بخاری، شوکت تھانوی، کنھیالال کپور، کرشن چندر، شفیق الرحمن، ابراہیم جلیس اور مشتاق احمد یوسفی ممتاز طنز نگار ہیں۔

(C) تنقید:

تنقید عربی کا لفظ ہے جو نقد سے ماخوذ ہے جس کے لغوی معنی ”کھرے اور کھوٹے کو پرکھنا“ ہے۔ اصطلاح میں اس کا مطلب کسی ادیب یا شاعر کے فن پارے کے حسن و قبح کا احاطہ کرتے ہوئے اس کا مقام و مرتبہ متعین کرنا ہے۔ خوبیوں اور خامیوں کی نشاندہی کر کے یہ ثابت کرنا مقصود ہوتا ہے کہ شاعر یا ادیب نے موضوع کے لحاظ سے اپنی تخلیقی کاوش کے ساتھ کس حد تک انصاف کیا ہے۔ مختصراً فن تنقید وہ فن ہے جس میں کسی فنکار کے تخلیق کردہ ادب پارے پر اصول و ضوابط و قواعد اور حق و انصاف سے بے لاگ تبصرہ کرتے ہوئے فیصلہ صادر کیا جاتا ہے اور حق و باطل، صحیح و غلط اور اچھے اور برے کے مابین ذاتی نظریات و اعتقادات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے فرق واضح کیا جاتا ہے۔ اس پر کھ اور تول کی بدولت قارئین میں ذوق سلیم پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ انگریزی میں تنقید کو Criticism کہتے ہیں۔ اس کا ماخذ یونانی لفظ Krinien ہے۔ ویسے مختلف نقادوں نے اس کی مختلف تعریف و توضیحات کی ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں۔

- (۱) کسی ادب پارے میں فن پارے کے خصائص اور ان کی نوعیت کا تعین کرنا۔
- (۲) تنقید کامل علم و بصیرت کے ساتھ اور موزوں اور مناسب طریقے سے کسی ادب پارے یا فن پارے کے محاسن و معائب کی قدر شناسی یا اس بارے میں فیصلہ صادر کرنا ہے۔
- (۳) تنقید اس عمل یا ذہنی حرکت کا نام ہے جو کسی شے یا ادب پارے کے بارے میں ان خصوصیات کا امتیاز کرے جو قیمت رکھتی ہے۔ بخلاف ان کے جن میں قیمت نہیں۔

(۴) محدود معنوں میں تنقید کا مطلب کسی ادب پارے کی خوبیوں اور خامیوں کا مطالعہ ہے، وسیع تر معنوں میں اس میں تنقید کے اصول قائم کرنا اور ان اصولوں کو تنقید کے لیے استعمال کرنا بھی شامل ہے۔

(۵) تنقید کا کام کسی مصنف کے کام کا تجزیہ، اس کی مدلل توضیح کے بعد اس کی جمالیاتی قدروں کے بارے میں فیصلہ صادر کرنا ہے۔

(۶) سچی تنقید کا فرض ہے کہ وہ زمانہ قدیم کے عظیم فن کاروں کی بالترتیب درجہ بندی اور رتبہ شناسی کرے اور زمانہ جدید کی تخلیقات کا بھی امتحان کرے۔ بلند تر نوع تنقید یہ بھی ہے کہ نقاد کے انداز و اسلوب کا تجزیہ کرے اور ان وسائل کی چھان بین کرے جن کی مدد سے شاعر اپنے ادراک و کشف کو اپنے قارئین تک پہنچاتا ہے۔

(۷) تنقید، فکر کا وہ شعبہ ہے جو یا تو یہ دریافت کرتا ہے کہ شاعری کیا ہے؟ اس کے مناصب و وظائف اور فوائد کیا ہیں؟ یہ کن خواہشات کو تسکین پہنچاتی ہے؟ شاعر شاعری کیوں کرتا ہے؟ اور لوگ اسے کیوں پڑھتے ہیں؟ یا پھر یہ اندازہ لگاتا ہے کہ کوئی شاعری یا نظم اچھی ہے یا بری۔ (ایلیٹ)

(D) تحقیق

تحقیق کا لفظی معنی پیدائش، آفرینش، پیدا کرنا، وجود میں لانا، تصنیف، اختراع اور ایجاد ہے۔ تحقیق حق کی نقاب کشائی ہے۔ سات پردوں میں چھپی سچائی کو ڈھونڈنا، مرتب کرنا اور ارباب علم و دانش کے سامنے پیش کرنے کا عمل تحقیق کہلاتا ہے۔ تنقید کا معاملہ بھی اس سے مختلف نہیں۔ نقد کہتے ہیں پر کھنے یا کسوٹی پر کسنے کو۔ اس کا پتہ لگانا کہ یہ چمکنے والی چیز سچ مچ سونا ہے، یا پیتل پر سونے کی ملمع کاری کی گئی ہے، تحقیق نہیں تو اور کیا ہے؟ تحقیق و تنقید صرف ادب کی چھان بین اور مویشگافی نہیں بلکہ ایک طرز زندگی، احقاق حق اور ابطال باطل بھی

ہے۔ آسان طبیعتیں تحقیق کے صبر آزما طریق کار کی متحمل نہیں ہو پاتیں، اسی لیے اس مشکل ڈگر کے بہت کم لوگ مسافر بنتے ہیں۔ نصیر الدین ہاشمی، محمود شیرانی، پروفیسر عبدالقادر سروری، ڈاکٹر محی الدین قادری زور، پروفیسر مسعود حسین خان، پروفیسر سیدہ جعفرہ اور مولوی عبدالحق وغیرہ اردو ادب کے نامور محققین ہیں۔

(E) تذکرہ

تذکرہ ایک مرکب صنف ادب ہے۔ اصطلاحاً اس لفظ کا اطلاق اس کتاب پر ہوتا ہے جس میں شعرا کے مختصر احوال اور ان کا منتخب کلام درج کیا گیا ہو علاوہ ازیں شعرا کے کلام پر مختصر الفاظ میں تنقیدی رائے بھی دی گئی ہو۔ سب سے پہلے شعرا کے حالات میں جو تذکرہ لکھا گیا وہ سرزمین ملتان میں ”لباب الالباب“ کے نام سے عوفی نے لکھا۔ یہ روایت آئندہ زمانے میں بھی ایران سے زیادہ ہندستان میں برقرار رہی اور عہد مغلیہ میں زبان فارسی میں کچھ اہم تذکرے لکھے گئے۔ ”طبقات اکبری“ اور ”منتخب التواریخ“ وغیرہ میں معاصرین شعرا کے مستند ترین حالات ملتے ہیں۔ تاریخوں کے علاوہ دوسرے فنون میں کتابیں بھی بحیثیت تذکرہ اہمیت رکھتی ہیں اور ان میں ”ہفت اقلیم“ کا نام سرفہرست ہے۔ آخری مغل دور میں آرزو اور خوشگو کے مستند تذکرے ملتے ہیں۔ اردو ادب کی ابتداء فارسی کے علما اور شعرا نے کی اور اردو تذکرہ نگاری بھی فارسی تذکرہ نویسوں نے شروع کی یا ان کے پیروکاروں نے اس فن کو فروغ دیا۔ چنانچہ عہد مغلیہ کے آخری زمانے میں ہمیں ایسے تذکرے ملتے ہیں جن میں اردو اور فارسی زبانوں کے شاعروں کے حالات موجود ہیں اور اس کے بعد ایک ایسا عہد بھی آیا جب ایک ہی تذکرہ نگار نے فارسی اور اردو شعرا کے الگ الگ تذکرے لکھے اور یہی وہ زمانہ بھی تھا جب مختلف مصنفین نے صرف اردو شعرا کے تذکرے لکھے جن میں سرفہرست اردو زبان

کا پہلا تذکرہ ”تذکرہ گلشن ہند“ (مرزا علی لطف) ، تذکرہ شعرائے اردو (میر حسن) ، تذکرہ گلشن بے خار (مصطفیٰ خاں شیفتہ) ، انتخاب یادگار (امیر مینائی) ، انتخاب دو اویں (امام بخش صہبائی) ، آب حیات و سخن دان فارس (محمد حسین آزاد) ، تذکرہ المعاصرین و سخن الشعراء (عبدالغفور نساج) ، تذکرہ ماہ و سال و تذکرہ معاصرین (مالک رام) ، مجموعہ نغز (قدرت اللہ قاسم) ، گل رعنا (مولوی عبدالحق) اور فارسی میں میر تقی میر کا ”نکات الشعراء“ ، فتح گردیزی کا ”تذکرہ ریختہ گویاں“ اور قیام الدین قائم کا ”مخزن نکات“ ، محمد ابراہیم خلیل ، کچھی نرائن شفیق ، قدرت اللہ شوق اور غلام ہمدانی مصحفی وغیرہ کے تذکرے بھی کافی مقبول ہیں۔

اصولی طور پر تذکرہ ذکر کے معنی سے مربوط ہے، عربی سے اردو میں مروج ہونے والا یہ لفظ مجرد حیثیت سے اردو میں رواج پایا اور فارسی کے زیر اثر اردو ادب میں اس لفظ کو صنف کی حیثیت حاصل ہوئی۔ عام انداز میں تذکرہ بہ معنی ذکر کے مروج ہے لیکن اصطلاحی اعتبار سے تذکرہ متعدد اشخاص کے حالات اور کارناموں کو ایک کتاب میں جمع کرنے کی شہادت دیتا ہے۔ یعنی تذکرہ ایک ایسی صنف ہے جس میں فن کے جلیل القدر اصحاب کی سوانح اور انفرادی خصوصیات کو واضح کیا جاتا ہے اس اعتبار سے تذکرہ کا فن ایک کتاب کا محتاج ہوتا ہے یعنی جب تک کئی اہم شخصیتوں کو مربوط نہ کیا جائے اس کی حیثیت تذکرہ نہ ہوگی۔ عام طور پر ایسی تمام تحریریں تذکرہ کے ضمن میں آئیں گی جن میں ایک سے زائد شخصیات کے حالات اور کارنامے اکٹھا کر کے کتابی شکل میں جمع کر دیے گئے ہوں اس عمل کے لیے لازمی نہیں کہ وہ شخصیتیں صرف ادبی حیثیت کی حامل ہوں بلکہ مذہبی، سیاسی، سماجی، ثقافتی، غرض کہ ہر شعبہ حیات سے تعلق رکھنے والے متعدد افراد کے حالات اور کارنامے کسی ایک کتاب میں جمع کر دینا تذکرہ کہلاتا ہے۔

☆ کتابیات

- (۱) اقبال، ڈاکٹر، کلیات اقبال، اقبال اکادمی لاہور، ۱۹۹۰ء
- (۲) اطہر پرویز، ہمارے پسندیدہ افسانے، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۲۰۱۳ء
- (۳) اُم ہانی اشرف، ڈاکٹر، اُردو مرثیہ نگاری، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۲۰۱۲ء
- (۴) اُم ہانی اشرف، ڈاکٹر، اُردو قصیدہ نگاری، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۲۰۱۳ء
- (۵) ارتضیٰ کریم، ڈاکٹر، آغا حشر کاشمیری عہد اور ادب، اُردو اکادمی دہلی، ۲۰۰۷ء
- (۶) الطاف حسین حالی، یادگار غالب، غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی، ۲۰۱۲ء
- (۷) احمد رضا مولانا، حدائق بخشش، رضا اکیڈمی، ۲۰۱۱ء
- (۸) اُردو ادب (اختیاری مضمون)، بی اے سال اول، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، ۲۰۰۷ء
- (۹) اُردو ادب (نثر)، بی اے سال دوم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، ۲۰۰۶ء
- (۱۰) اُردو ادب (ادبی تنقید)، بی اے سال سوم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، ۲۰۱۱ء
- (۱۱) اُردو ادب (نظم)، بی اے سال سوم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، ۲۰۱۱ء
- (۱۲) دردانہ قاسمی، داستان ناول اور افسانہ، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۲۰۱۳ء
- (۱۳) درس بلاغت، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی، ۲۰۱۲ء
- (۱۴) داستان، ڈرامہ، ناول اور افسانہ (ساتواں پرچہ)، ایم اے سال دوم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، ۲۰۰۷ء
- (۱۵) رجب علی بیگ سرور، فسانہ عجائب، انجمن ترقی اردو دہلی، ۲۰۱۳ء
- (۱۶) سنبل نگار، ڈاکٹر، اُردو شاعری کا تنقیدی مطالعہ، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۲۰۱۳ء
- (۱۷) سنبل نگار، ڈاکٹر، اُردو نثر کا تنقیدی مطالعہ، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۲۰۱۳ء
- (۱۸) سید اعجاز حسین، ڈاکٹر، مختصر تاریخ ادب اُردو، اعجاز پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۱۹۶۴ء

- (۱۹) عظیم الحق جنیدی، اُردو ادب کی تاریخ، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۲۰۱۵ء
- (۲۰) عبادت بریلوی، اُردو تنقید کا ارتقاء، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۲۰۱۳ء
- (۲۱) عبدالصمد دہلوی، آئین اردو، ایم آر پی بلی کیشنز، ۲۰۱۶ء
- (۲۲) غیر افسانوی ادب (آٹھواں پرچہ)، ایم اے سال دوم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، ۲۰۰۷ء
- (۲۳) فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اردو کی بہترین مثنویاں، ایم آر پی بلی کیشنز نئی دہلی، ۲۰۱۳ء
- (۲۴) قمر الہدیٰ فریدی، ڈاکٹر، مثنوی سحر البیان، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۲۰۱۳ء
- (۲۵) میرامن، باغ و بہار، اعجاز پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی، ۲۰۰۳ء
- (۲۶) محی الدین قادری زور، ڈاکٹر، کئی ادب کی تاریخ، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۲۰۱۳ء
- (۲۷) محمد حسین، پروفیسر، انشائیہ اور انشائیے، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۲۰۱۲ء
- (۲۸) مظہر احمد، پیروڈی، شبانہ پبلی کیشنز دہلی، ۱۹۹۱ء
- (۲۹) نور الحسن نقوی، پروفیسر، فن تنقید اور تنقید نگاری، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۲۰۱۳ء
- (۳۰) وقار عظیم، داستان سے افسانے تک، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۲۰۰۹ء
- (۳۱) وقار عظیم، نیا افسانہ، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۲۰۰۹ء
- (۳۲) ریختہ ڈاٹ کام
- (۳۳) وکی پیڈیا

☆☆☆☆